جون ۱۹۹۴ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

• حسابِ کم و بیش

یعنی امیر تنظیم اسلامی کے بعض ذاتی اور مالی و معاشی
ان کے اپنے قلم سے

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلا

خوشبودار کیمیکل

مختلف اقسام کے عطریات' اگر بتی' صابن وغیرہ
کی صنعتوں کے لئے عوامی جمہوریہ چین سے
خوشبو دار کیمیکل (پرفیومری' کیمیکل) درآمد
کرنے کے خواہش مند حضرات رابطہ کریں۔

ربی ٹریڈنگ کمپنی (پرائیویٹ) لمیٹڈ

پوسٹ بکس نمبر 238' کراچی 74200

نماز قائم کریں' اسی میں نجات اور سکون ہے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد: ۴۳
شمارہ: ۵
محرم الحرام ۱۴۱۵ھ
جون ۱۹۹۴ء
فی شمارہ ۷/-
سالانہ زرتعاون ۷۰/-

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

برائے سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات اور بھارت	۴۵ سعودی ریال یا ۱۲ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ۔	۱۶ امریکی ڈالر
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۲۰ امریکی ڈالر
ایران، عراق، اومان، مسقط، ترکی، شام، اردن، بنگلہ دیش، مصر	۹ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارہ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰۔ فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴
سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ عرضِ احوال ——— ۳
حافظ عاکف سعید

☆ تذکرہ و تبصرہ ——— ۵
اہم ملکی و ملی مسائل کے بارے میں تجزیہ
امیر تنظیم اسلامی کے خطاباتِ جمعہ کے پریس ریلیز

☆ الہدیٰ (قسط: ۹۲) ——— ۱۱
مدنی دور کے آغاز میں اہل ایمان کو پیشگی تنبیہہ (۳)
ڈاکٹر اسرار احمد

☆ حسابِ کم و بیش ——— ۱۹
یعنی امیر تنظیم اسلامی کے بعض ذاتی اور مالی و معاشی کوائف
ان کے اپنے قلم سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

زیر نظر شمارے کا مرکزی مضمون تو وہی ہے کہ جس کا حوالہ "میثاق" کے سرورق پر دیا گیا ہے یعنی "حسابِ کم و بیش" کے عنوان سے امیر تنظیم اسلامی کا وہ مفصل مضمون جس میں انہوں نے اپنے مالی و معاشی حالات کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے اور ضمناً کچھ دیگر ذاتی و خاندانی معاملات بھی زیر بحث آئے ہیں۔ آج کے دور میں کسی ایسی شخصیت کو کہ جو کسی بھی حوالے سے معروف ہو گئی ہو' داغدار کرنے کے لئے جو مختلف حربے اختیار کئے جاتے ہیں ان میں ذریعہ معاش اور مالی معاملات کے حوالے سے کسی اسکینڈل کا اچھالنا سب سے زیادہ مروّج ہے اور شاید آسان ترین بھی یہی ہے۔ معاش کا مسئلہ فی الواقع اتنا گھمبیر اور سنگین ہو چکا ہے اور فی زمانہ اتنی اہمیت اختیار کر چکا ہے کہ آج بجا طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان کا اہم ترین اور مرکزی مسئلہ معاش ہی کا ہے اور بقیہ تمام مسائل اسی کی فروعات ہیں اور اس اعتبار سے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ یہودی ایک نہایت قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے مالیاتی نظام کے بل پر پوری دنیا پر حاوی ہیں اور' یہ بات اگرچہ ضمنی ہے تاہم دلچسپی سے خالی نہیں کہ' دجالی فتنے کے مظاہر میں سے اہم ترین مظہر احادیثِ مبارکہ کے حوالے سے یہ سامنے آتا ہے کہ ذرائع پیداوار اور وسائلِ معیشت پر اس کو مکمل تسلط حاصل ہو گا اور اسی حوالے سے وہ لوگوں کو کفر پر مجبور کرے گا کہ پہلے اپنی زبان سے کلمۂ کفر ادا کرو پھر تمہیں کھانے کو روٹی ملے گی۔ آج ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ ملکی بجٹ اور معیشت سے متعلق ہماری جو پالیسی بھی بنتی ہے وہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے تابع ہوتی ہے' ان کا انداز تحکمانہ ہوتا ہے کہ ہماری بنائی ہوئی پالیسی کو اگر اختیار نہیں کرو گے تو تمہارا دانہ پانی بند کر دیا جائے گا اور ہم جو اپنے کرتوتوں کے سبب سے حقیقی ایمان سے محروم ہو چکے ہیں' چار و ناچار ان کے "احکامات" کے سامنے اپنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہیں!!

وہ شخصیات جن کی شہرت دین کے حوالے سے ہو' ان کا معاملہ اس پہلو سے اور زیادہ نازک اور اہم ہو جاتا ہے کہ اگر پبلک کے سامنے یہ بات آئے کہ انہوں نے دین کو بھی دراصل دنیاداری کے لئے استعمال کیا اور خدمتِ دین کے پردے میں وہ اپنا بینک بیلنس بڑھانے اور جائیدادیں بنانے

پر کمربستہ رہے تو دعوت و تبلیغ کے میدان میں کی گئی ان کی تمام محنت اپنی اثر انگیزی کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ صفر ہو کر رہ جاتی ہے بلکہ یہ چیز دین اور رجالِ دین کی بدنامی کا باعث بنتی ہے اور اس طرح بالواسطہ طور پر عوام کو دین سے برگشتہ کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اور چونکہ ہمارے معاشرے میں ایسے واقعات کی کمی نہیں ہے کہ جن میں دین کو حصولِ دنیا کا ذریعہ بنایا گیا ہو لہٰذا پبلک میں ہر ایسے شخص کو جو خدمتِ دین کا عزم لے کر میدان میں آئے، شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، خود وہ لوگ جو ہماری اس دعوت سے متاثر ہوتے اور تنظیم میں شامل ہونے کا جذبہ لے کر ہمارے قریب آتے ہیں، ان کے ذہنوں میں بھی یہ سوالات کلبلا رہے ہوتے ہیں کہ امیر تنظیم کا ذریعہ آمدن کیا ہے، ان کی گزر بسر کے ذرائع کیا ہیں، وہ تنظیم سے کوئی ماہانہ مشاہرہ لیتے ہیں یا انجمن خدام القرآن کے تنخواہ دار ہیں، وغیرہ۔ تنظیم کے سالانہ اجتماعات میں امیر تنظیم وقتاً فوقتاً ان امور کی وضاحت کرتے رہتے ہیں لیکن ظاہر بات ہے کہ ہر سالانہ اجتماع میں ان باتوں کا دہرایا جانا بھی خلافِ مصلحت ہے، اس لئے کہ اس میں دلچسپی تو صرف ان نئے رفقاء کو ہوتی ہے جو ان امور سے ابھی تک باخبر نہ ہوئے ہوں۔ چنانچہ رفقاء کی طرف سے بارہا یہ تقاضا سامنے آیا کہ ان تمام تفصیلات کو مدون کر کے ایک کتابچے کی صورت میں شائع کر دینا چاہئے تاکہ نئے شامل ہونے والے رفقاء اور وہ احباب جو تنظیم اسلامی یا تحریک خلافت میں شمولیت کے لئے آمادہ نظر آتے ہوں، اس کتابچے کو پڑھ کر اپنے اشکالات کے ضمن میں تشفی حاصل کر سکیں!

اس مضمون کی اشاعت کا ایک اضافی فائدہ، ان شاء اللہ، یہ بھی ہو گا کہ وہ رفقاء جو خدمت دینی کے جذبے سے سرشار ہو کر تنظیم اسلامی میں داخل ہوتے ہیں لیکن مالی حالات اور مستقبل کے اندیشوں کے پیش نظر اس میدان میں کچھ زیادہ پیش رفت نہیں کر پاتے، وہ اس مضمون کے ذریعے اپنے اندر ایک ولولۂ تازہ محسوس کریں گے اور امیر تنظیم کے یہ تمام حالات پڑھ کر انہیں بھی شاید یہ ہمت ہو کہ وہ کسی مادی سہارے کے بغیر بالکلیہ اللہ پر توکل کرتے ہوئے خود کو خدمت دینی کے لئے وقف کرنے پر آمادہ کر سکیں اور معاشی میدان میں امیر تنظیم کی یہ عزیمت جو بلاشبہ اللہ کے خصوصی فضل و کرم کا مظہر ہے، ان کے لئے کسی مستقل خیر کا ذریعہ بن جائے۔ وما ذٰلک علی اللّٰہ بعزیز○○

○○○

اہم ملکی و ملی مسائل کے بارے میں امیر تنظیم اسلامی کا تجزیہ

۶ مئی، ۱۳ مئی اور ۲۰ مئی کے خطابات جمعہ کے پریس ریلیز

-------(۱)-------

کیا پاکستان کے خاتمے کا آغاز ہو چکا ہے؟

لاہور۔ ۶/ مئی : داعیٔ تحریک خلافت پاکستان و امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک جامع پانچ نکاتی لائحہ عمل پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسے پورے کا پورا اختیار نہ کیا گیا تو پاکستان کے خاتمے کا وہ عمل ہماری دعاؤں کے علی الرغم بھی مکمل ہو کر رہے گا جس کا آغاز ہو چکا ہے۔ مسجد دار السلام باغ جناح میں جمعہ کے بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ایک قومی اخبار نے میری اس تقریر کے اشتہار کو موجودہ عنوان کے ساتھ شائع کرنے سے انکار کر دیا جسے میں قومی حمیت سے تعبیر کر کے قابل قدر سمجھتا ہوں، لیکن اسے بھی یہ تو ضرور سوچنا چاہئے کہ کبوتر اپنی آنکھیں بند کر لے تو وہ بلی غائب نہیں ہو جاتی جو اس کی تاک میں ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ہر باشعور اور محبِ وطن پاکستانی کے دل و دماغ میں وطن کی فکر میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی ہیں، تاہم ہر شخص کے نزدیک صورت حال کی وجوہات اور تدارک کی تدابیر مختلف ہو سکتی ہیں، جبکہ قرآن حکیم کا ایک طالب علم ہونے کے ناتے مجھے یہ سب کچھ اسی کتاب ہدایت سے حاصل ہوتا ہے جس میں پچھلوں کے حالات ہی نہیں اگلوں کی خبریں بھی پائی جاتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سورۃ الروم کی آیت ۴۱ میں فرمایا گیا کہ : "بحر و بر میں لوگوں کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے فساد ظاہر ہو گیا ہے تاکہ ان کے بعض اعمال کا مزا انہیں چکھایا جائے تو شاید وہ لوٹ آئیں۔" پھر سورۃ السجدہ کی آیت ۲۱ کا مضمون یہ ہے کہ : "بڑے عذاب سے پہلے انہیں چھوٹے عذاب سے گزارا جائے گا کہ شاید وہ سنبھل کر پلٹ آئیں۔"

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ہم نے اپنی قومی زندگی کے ان ۴۷ برسوں میں اپنے ہاتھوں جو کمائی کی ہے اس کی سزا سورۃ الانعام کی آیت ۶۵ میں وارد ہونے والی وعید کے عین مطابق ہے کہ "اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ تم پر اوپر سے عذاب نازل فرمائیں یا تمہارے قدموں کے نیچے سے یا پھر تمہیں باہم متصادم گروہوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کی قوت کا مزا چکھا دیں۔" امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ سندھ کے بڑے شہروں بالخصوص کراچی میں گزشتہ چھ دن خونریزی کی جو کیفیت رہی اور شیعہ سنی جھگڑوں کے بعد اب ان عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے فساد کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں جن کی پشت پر پوری عیسائی دنیا موجود ہے۔ اور جہاں تک زمین و آسمان سے

عذاب نازل ہونے کا تعلق ہے تو وہ بھی بجلی اور پانی کی نایابی کی شکل میں ہمیں گھیرے میں لے رہا ہے جس کی شدت میں کالا باغ ڈیم کے بننے تک اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا، وہی کالا باغ ڈیم جو ہمارے سیاستدانوں کے گروہی مفادات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کبھی ظلم روا نہیں رکھتے اور جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے اس کا جواز کسی نے سمجھنا ہو تو سورۃ التوبہ کی آیات ۷۵ تا ۷۷ کا مطالعہ کرے جہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر انہیں فراوانی عطا کی جائے تو وہ اللہ کی راہ میں خرچ کریں گے اور نیکوکار بن کر رہیں گے لیکن جب انہیں فضل و کرم سے نوازا گیا تو اپنے عہد و پیمان سے پھر گئے جس کی سزا میں ان کے دلوں میں ہمیشہ کے لئے نفاق ڈال دیا گیا۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ احادیث مبارکہ میں نفاق کی جو نشانیاں بیان کی گئی ہیں وہ بکمال و تمام ہمارے خواص و عوام میں پائی جاتی ہیں اور حکومتی، سیاسی بلکہ مذہبی قیادتوں میں تو سوائے چند مستثنیات کے یہ علامات مبالغے کی حد تک موجود ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لوگوں میں مشہور ہو گیا ہے کہ وزیر اعلیٰ سندھ براہ راست بھارت کے ایجنٹ ہیں تو اس زبانِ خلق کو نقارۂ خدا کیوں نہ سمجھا جائے، جبکہ بھارت نے کچھ ہی دنوں پہلے ہمیں دھمکی دی تھی کہ کشمیر کی رٹ لگانے والوں کو خود بہت جلد سندھ کے لالے پڑ جائیں گے۔ افواہ یہ بھی گرم ہے اور بہت وثوق سے بتایا جاتا ہے کہ الطاف حسین نے لندن میں اپنی رہائش کے لئے بیالیس لاکھ پاؤنڈ سٹرلنگ کا مکان خرید رکھا ہے، نیویارک میں پانچ کروڑ ڈالر میں خریدا ہوا ان کا ہوٹل شب و روز مال بنا رہا ہے اور یہ کہ ان کے پاس نقد موجود رقم کی مالیت دس ارب روپے ہے۔ پی پی پی کے ڈاکٹر غلام حسین کے حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ پاکستانیوں کے ساٹھ ارب ڈالر باہر کے بینکوں میں جمع ہیں جن کو اگر واپس منگایا جا سکے تو بیس ارب ڈالر کا پورا غیر ملکی قرضہ بیک مشت ادا کر کے عالمی مالیاتی اداروں کے منہ پر چپت رسید کی جا سکتی ہے اور باقی چالیس ارب ڈالر سے پاکستانی معیشت کی از سر نو تعمیر ممکن ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے ان پاکستانیوں کی کھال کھینچنی ہوگی اور یہ کون کرے۔ کس کا دامن اتنا صاف ہے کہ دوسروں کو ٹکٹکی پر باندھنے کی ہمت کر سکے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ بعض سندھی بھارت کے اشاروں پر بے سوچے بغیر ناچ رہے ہیں کہ سندھ کو پاکستان سے جدا کر کے اس کی لاش نوچنے کے لئے کون کون سے گدھ سامنے منتظر ہیں، اور ایم کیو ایم کا سازشی عنصر نیو ورلڈ آرڈر کے لئے ہانگ کانگ کا متبادل تیار کرنے کے لئے کراچی کو سندھ سے کاٹنا چاہتا ہے۔ انہوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے وزیر داخلہ نے یہ فرما کر اپنے خیال میں بڑا تیر مارا ہے کہ الطاف حسین کا حشر مجیب الرحمن جیسا ہو گا۔ کیا انہیں یہ یاد نہیں کہ مجیب کا حشر تو جو ہوا سو ہوا وہ ہمارے ملک کو تو دولخت کر ہی گیا تھا۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ بد دیانتی اور لوٹ کھسوٹ کی اس ملک میں انتہا ہو چکی ہے اور کسی کا دامن ان دھبوں سے پاک نہیں۔ کروڑوں اربوں کے غبن سامنے آتے ہیں اور چند دن اخباروں میں سنسنی پھیلا کر گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے سوال کیا کہ آج کے زمانے میں اس ملک کا بھی کوئی مستقبل ہو سکتا ہے جہاں احتساب کی کوئی روایت ہی موجود نہ ہو۔ لیاقت علی خاں کے قتل سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ تک اور اس کے بعد بھی سینکڑوں کمیشن بیٹھے لیکن کسی ایک کی بھی رپورٹ منظر عام پر نہ آئی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ان حالات میں مجھے تو یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ پاکستان کے خاتمے کا آغاز ہو چکا ہے اور اگر ملک کو بچانا مقصود ہے تو پانچ امور کی طرف فوری پیش قدمی لازم ہے' جن میں سے اولین یہ ہے کہ کتاب و سنت کو مکمل بالادستی کا مقام دیا جائے کیونکہ پاکستان کی واحد وجہ جواز یہی ہے' ورنہ یہ ملک ہم نے برلوں اور ٹاٹاؤں کے باپ پیدا کرنے اور جاگیرداری کو تحفظ دینے کے لئے نہیں بنایا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہم جوہری توانائی کو ہر مقصد کے لئے استعمال کریں اور ڈنکے کی چوٹ ایٹم بم بھی بنائیں' کیونکہ نیو ورلڈ آرڈر کو چیلنج کر کے ہی ہم اپنی قوم میں ایک نئی روح پھونک سکتے ہیں۔ تیسرے سود کا مکمل خاتمہ کیا جائے اور اس سلسلے میں وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے پر پوری دیانتداری سے عمل کیا جائے۔ چوتھے صدارتی نظام کو اختیار کیا جائے کیونکہ انگریزوں کی لعنتی وراثت پارلیمانی نظام ہمارے ہاں سیاسی بدعنوانی کی جڑ اور عدم استحکام کا اصل باعث ہے۔ اور آخری بات یہ کہ صوبوں کی نئی حد بندی کی جائے۔ پنجاب کو چھ صوبوں میں' سندھ کو تین صوبوں میں اور سرحد و بلوچستان کو بھی چھوٹے انتظامی یونٹوں میں تقسیم کرنا ضروری ہو چکا ہے جس کے بغیر سندھ کا مسئلہ کبھی حل نہ ہو گا۔ آخر میں ڈاکٹر اسرار احمد نے پاکستان کے مسلمانوں کو قومِ یونسؑ کی طرح توبہ کی تلقین کی جس کے بعد عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ایک بار پھر جوش میں آئے۔ انہوں نے کہا کہ ضرورت اجتماعی توبہ کی ہے لیکن اس سے پہلے ہم میں سے ہر شخص کو انفرادی توبہ کر کے کم از کم اپنی زندگی پر تو خلافت قائم کر ہی دینی چاہئے۔ ○○

-------(۲)------

پاکستان کی سالمیت اور مسئلہ سندھ

لاہور۔ ۱۳/ مئی : امیر تنظیم اسلامی و داعیٔ تحریک خلافت ڈاکٹر اسرار احمد نے دعویٰ کیا ہے کہ سندھ کے مسئلے کا صوبے کی تقسیم کے سوا کوئی حل نہیں' اور کوئی ہے تو سامنے لایا جائے' کیونکہ اسے فوج کے حوالے کئے رکھنا وہاں نیم مارشل لاء کا تسلسل ہے جس کی وکالت جمہوریت کے دعویداروں کو زیب نہیں دیتی۔ مسجد دارالسلام باغ جناح کے خطاب جمعہ میں انہوں نے کہا

کہ کراچی کی اتنی بڑی آبادی کو دیوار سے لگا کر رکھنے میں ملک و قوم کا مفاد ہرگز نہیں' جو پاکستان پر اس کے دوسرے شہریوں سے کم حق نہیں رکھتی۔ ایم کیو ایم حقیقی کے چیئرمین آفاق احمد کے انتباہ کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ واشنگٹن پلان محض کوئی واہمہ نہیں ہے۔ ان کی یہ اطلاعات بالکل درست نہ بھی ہوں کہ کئی امریکی کمپنیوں کو کراچی کی بندرگاہ کے متعدد اہم ترین حصے لیز پر دے دیئے گئے ہیں اور امریکی بینکوں کی کراچی میں موجود شاخوں میں دہشت گردوں کے اکاؤنٹ چل رہے ہیں تب بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر کو ایک نئے ہانگ کانگ کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے' چنانچہ ایم کیو ایم کے لیڈروں سے امریکی سفارتی عملے کے روابط بڑھتے چلے جا رہے ہیں' جن پر اخباری اطلاعات کے مطابق حکومت پاکستان نے احتجاج بھی کیا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ ان بین الاقوامی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لئے سندھ میں آباد مہاجروں کو مطمئن کرنا ضروری ہے جو صوبائی سطح پر ان کے معاملات خود انہی کے ہاتھوں میں دیئے بغیر ممکن نہیں اور اس کے لئے صوبے کی تقسیم لازم ہے۔ تاہم تقسیم کا فارمولا صرف سندھ پر استعمال ہوا اور پنجاب کو بھی لسانی ثقافتی بنیادوں پر اس کے تقریباً مساوی ٹکڑوں میں تقسیم نہ کیا گیا تو سندھی اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ مشرقی پنجاب ہمارے مغربی پنجاب سے رقبے میں پہلے ہی چھوٹا تھا لیکن اسے بھی ایک عرصہ پہلے تین صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اس سے بھارت کی سالمیت پر آج تک کوئی آنچ نہیں آئی۔ انہوں نے کہا کہ صوبوں کی تقسیم اور صدارتی نظام کے حق میں میری حمایت دینی اصولوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ سیاسی حکمت عملی کا تقاضا ہے' ورنہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور کتاب و سنت کی مکمل بالادستی کے تحت حکومت کا کوئی بھی بندوبست اسلام میں مباح ہے۔ میرے نزدیک اگرچہ صدارتی نظام خلافت کے نظام سے قریب تر ہے تاہم پارلیمانی نظام کی خرابیوں کا کوئی علاج نکال لیا جائے تو وہ بھی خلافت کی ضد نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے اس اعتراض کے جواب میں کہ "پارلیمانی نظام انگریز کی وراثت ہے تو صدارتی نظام بھی امریکہ کا عطیہ ہے" کہا کہ پھر یہ بھی تو دیکھا جانا چاہئے کہ انگریز کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا اور امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور ہے۔ انہوں نے کہا کہ پارلیمانی نظام میں قوت کے دو مراکز صدر اور وزیر اعظم کے نام سے وجود میں آجاتے ہیں جن کے درمیان اختیارات کی تقسیم میں توازن برقرار رکھنا تقریباً ناممکن ہے' جبکہ توحید کے حق میں قرآن مجید میں ایک دلیل یہ بیان ہوئی ہے کہ خدائی اختیارات رکھنے والے معبود اگر دو ہوتے تو کائنات فساد سے بھر کر رہ جاتی۔ صدارتی نظام کے جواز میں ایک دلیل کے طور پر ڈاکٹر اسرار احمد نے مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ کی علیحدگی کے اصول کا ذکر کیا جسے اب ایک عصری تقاضے کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور جو

صدارتی نظام حکومت میں ہی ممکن ہے' جبکہ پارلیمانی نظام میں متفنہ اور انتظامیہ ہمیشہ گڈ مڈ رہتی ہے۔

قبل ازیں ڈاکٹر اسرار احمد نے حج اور قربانی کے شعائر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ اللہ کے خلیل' ابوالانبیاء اور امام الناس ابراہیم علیہ السلام کی مثالی زندگی کے نقوش ہیں جو شروع سے آخر تک کڑے امتحان سے عبارت ہے۔ انہوں نے کہا کہ اپنی طویل اور ابدی زندگی کا وہ مختصر حصہ جو ہم دنیا میں گزارتے ہیں دراصل ایک امتحان ہے جس سے افراد اور قوموں دونوں کو گزرنا پڑتا ہے' البتہ فرق یہ ہے کہ افراد کے امتحان کا آخری نتیجہ آخرت میں نکلتا ہے جبکہ اقوام کے امتحان کے پورے نتائج اسی دنیا میں ظاہر کر دیئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ امتِ مسلمہ کو یہ امتحان درپیش ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد وہ اللہ کے بندوں کو اس کا دین پہنچانے کا فرض ادا کرتے ہیں یا نہیں' جس میں عرب تو ناکام ہو کر اغیار کے شکنجے میں جکڑے جا چکے ہیں' اگلی باری ہماری ہے' کیونکہ ہم نے بھی پاکستان کو اللہ تعالیٰ سے اسلام کا نمونہ بنانے کے لئے مانگا تھا۔ اب ہم امتحان کے عرصۂ محشر میں ہیں جس میں سرخروئی کے حصول کے لئے ہمیں ملکِ خداداد کو اسلام کے نظام عدل و قسط کے ماڈل کے طور پر پیش کر کے پوری دنیا پر حجت تمام کرنی ہے۔ اس مشن میں ہم اسی طرح ناکام رہے جیسے اب تک ہیں تو پاکستان کے وجود کا کوئی جواز نہ رہے گا اور ویسے بھی پاکستان کو نہ تاریخ کی پشت پناہی حاصل ہے نہ جغرافیہ کا تحفظ' جبکہ کوئی نسلی' لسانی اور تہذیبی تقدس بھی اس کی یکجائی کے لئے میسر نہیں ہے اور صرف اسلام ہی وہ رشتہ ہے جو اس کی آبادی کو متحد رکھ سکتا ہے۔ ○○

-------(۳)------

امریکی عیاری کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جانا چاہئے!

قوم ایٹمی تنصیبات کے معائنے کی اجازت نہیں دے گی

لاہور۔ ۲۰/ مئی : امیر تنظیم اسلامی اور داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ قومی اور بین الاقوامی سیاست میں میکیاولی اور چانکیہ کے بدنام زمانہ موقع پرستانہ اصول پہلے بھی استعمال ہوتے رہے ہیں لیکن جس عیاری سے اب بڑے پیمانے پر کام لیا جا رہا ہے اس کا مقابلہ صرف اپنے مبنی برحق موقف پر ڈٹ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ مسجد دارالسلام باغ جناح کے اپنے خطاب جمعہ میں انہوں نے کہا کہ دنیا کی واحد سپر پاور امریکہ کو عیاری کا یہ استعمال زیب نہیں دیتا جو اس کے بغیر بھی دنیا کو اپنے اشاروں پر چلا سکتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ پاکستان کے ساتھ اپنے معاملات میں امریکہ کسی ایک موقف پر قائم نہیں رہتا اور پینترے بدلتا رہتا ہے' جس کا عکس

ہماری حکومت کی حکمت عملی میں بھی نظر آنے لگا ہے جس کے ذمہ دار ترجمان حساس مسائل پر قوم کا شاید ردعمل ہی دیکھنے کے لئے متضاد بیانات دیتے رہتے ہیں۔ ڈپلومیسی کے اس انداز کی ایک مثال تو خاموش سفارتکاری کی پراسرار اصطلاح ہے اور دوسرا شوشا ہمارے وزیر خارجہ نے قوم کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں انہی دنوں چھوڑا ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ ہم اتنے بے خبر نہیں کہ یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ امریکہ اپنے وسیع اور موثر جاسوسی نظام کے بل پر ہماری ہر بات سے بروقت آگاہ ہو جاتا ہے اور اس کے جاسوسی کے لئے مخصوص خلائی سیارے زیر زمین حقائق کو بھی برآمد کرلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں' لیکن اس کے باوجود قوم اپنی ایٹمی تنصیبات کو معائنے کے لئے کھولنے کی اجازت نہیں دے گی' جس کا مطلب اپنے جوہری پروگرام پر امریکہ کی براہ راست نگرانی اور بالادستی کو قبول کرلینا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ میرا تعلق حزب اقتدار سے ہے نہ حزب اختلاف سے' تاہم نوابزادہ نصراللہ خان اور محمد نواز شریف صاحب کے اس موضوع پر بیانات کی تائید کرنا میرا قومی فرض ہے۔ انہوں نے قوم کو خبردار کیا کہ بھارت اور اسرائیل کے مقابلے میں کھڑا ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ نے جوہری صلاحیت دے کر ہمیں اپنے خاص فضل سے نوازا ہے جس کی ہم نے ہتھیاروں میں بھی استعمال کر کے پوری قدر نہ کی تو پھر ہمیں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے محروم ہونا پڑے گا۔

مالاکنڈ میں نفاذ شریعت کے حق میں مظاہرے اور دھرنے کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اگرچہ مقاصد بھی بہت محدود تھے کہ شریعت کا نفاذ پورے ملک میں مطلوب ہونا چاہئے تھا اور مقام کا انتخاب بھی غلط تھا کیونکہ عام شاہراہ کو بند کر کے علاقے کے عام لوگوں کو بلاوجہ تکلیف میں ڈالا گیا' تاہم عزم و ارادے کی پختگی کے ساتھ پرامن مظاہرے میں اپنے جائز مطالبات منوانے کی قوت کا ایک بار پھر اثبات ہو گیا ہے جسے نظام کی تبدیلی کے لئے میرے انقلابی لائحہ عمل میں آخری مرحلے کی حیثیت حاصل ہے اور جس کا اظہار اہل تشیع کی طرف سے اسلام آباد سیکرٹیریٹ کے گھیراؤ کے ذریعے زکوٰۃ کے معاملے میں اپنا مطالبہ منوانے سے بھی ہوا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ مولانا صوفی محمد کی زیر قیادت مرکزی اجتماع اور اصل دھرنے کے مقام پر کوئی بدنظمی نہیں ہوئی اور تصادم کے بعد جانوں کا افسوسناک اتلاف ایک دوسرے راستے پر ہوا جسے ایک غیر منظم ہجوم غیر ضروری طور پر بند کر رہا تھا۔ تاہم اگر یہ اطلاع درست ہے کہ خشت باری اور فائرنگ کا آغاز جوشیلے ہجوم کی طرف سے ہوا تو میں لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے حکومتی مشینری کی جوابی کارروائی کی مذمت نہیں کروں گا' کیونکہ مظاہرے کو پرامن اور ایک مضبوط نظم کا پابند رکھنا میرے نزدیک قائدین کی اولین ذمہ داری ہوتی ہے۔ ○○

مدنی دور کے آغاز میں

اہلِ ایمان کو پیشگی تنبیہہ (۳)

(مباحثِ صبرو مصابرت' درس ۴)

(گزشتہ سے پیوستہ)

قرآن حکیم کے مطالعے سے صبر کا جو تصور سامنے آتا ہے اس کی رو سے صبر ہرگز کوئی منفی شے نہیں ہے بلکہ یہ ایک مثبت جذبہ ہے۔ کسی مقصد کی تکمیل کی خاطر یا کسی نصب العین اور منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد میں جو تکالیف آئیں اور اس راہ کی رکاوٹوں سے نبرد آزما ہونے میں جو مصائب آئیں انہیں ثابت قدمی کے ساتھ جھیلنا اور برداشت کرنا صبر ہے' جو یقیناً ایک مثبت جذبہ ہے۔ صبرو استقلال کا مظاہرہ کرنے والے باہمت لوگوں کے بارے میں ہی یہ الفاظ یہاں آئے ہیں : ﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ﴾ "اور (اے نبیؐ) بشارت دیجئے صبر کرنے والوں کو!"

صبر کے حوالے سے یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ اللہ کی راہ میں قتال کرنے والا کوئی شخص اگر میدان جنگ میں پامردی اور استقامت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے جان بچانے کے لئے وہاں سے راہِ فرار اختیار کرے گا تو اس کا یہ عمل دراصل اللہ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس کا سب کچھ کیا دھرا ضائع ہو جائے گا' بلکہ سورۃ الانفال میں تو ایسے شخص کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ تو یہاں پیشگی متنبّہ کر دیا گیا کہ اس راہ میں آزمائشیں اور مشکلات تو آئیں گی اور ان میں سرخرو وہی ہو سکیں گے جو صبرو ثبات کا مظاہرہ کریں گے۔ اگلی آیت میں ان صبر کرنے والوں کے ایک نہایت اہم وصف کا ذکر ہے :

﴿اَلَّذِينَ اِذَآ اَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوْآ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُونَ ○﴾

"(وہ صبر کرنے والے کون ہیں؟) وہ لوگ کہ جب بھی کوئی مصیبت ان پر پڑتی ہے یا کوئی تکلیف انہیں پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہم لوٹنے والے ہیں۔"

اسی سورۂ مبارکہ میں ذرا آگے چل کر وہ آیۂ بر ہے جو ہمارے اس منتخب نصاب کے حصۂ اول میں شامل ہے۔ وہاں ہم دیکھ چکے ہیں کہ نیکی کی بحث کا نقطۂ عروج یہی مضمون ہے: ﴿وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ﴾ "اور خصوصاً صبر کرنے اور جھیلنے والے جسمانی اذیت کو' فقر اور فاقے کو اور وہ کہ جو عین حالتِ جنگ میں ثابت قدم رہنے والے ہیں۔" یہاں ان صبر کرنے والوں کی یہ شان بیان ہوئی کہ جب بھی انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے' کوئی چٹان پر پڑتی ہے تو ان کی زبان پر یہ کلمہ جاری ہو جاتا ہے کہ: ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ۝﴾

بندۂ مومن کا نظریۂ حیات

اس آیۂ مبارکہ میں دراصل ایک مسلمان کے نظریۂ زندگی اور تصورِ حیات کی مکمل عکاسی موجود ہے۔ ہمارا تصورِ حیات کیا ہے؟ — ہم اللہ کے پاس سے آرہے ہیں اور اللہ ہی کے پاس واپس لوٹ جائیں گے۔ یہ دنیوی زندگی ایک سفر ہے' یہ ہرگز ہماری منزل نہیں ہے۔ یہ ہمارے سفرِ حیات کا ایک عارضی سا وقفہ ہے۔ اِس دنیا میں رہتے ہوئے ہم پر یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ ہم آئے کدھر سے ہیں اور اپنی اس منزل کا بھی واضح شعور ہمیں ہونا چاہئے جہاں ہمیں جانا ہے۔ اسی حقیقت کا اظہار اس آیۂ مبارکہ میں ہے کہ ہمارا وجود بھی اللہ کا عطا کردہ ہے اور ہمیں حیات بھی اسی نے عطا کی ہے۔ لہٰذا ع "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے" اللہ ہمارے بارے میں جو فیصلہ بھی کرے ہمیں قبول ہے۔ اس کی مرضی کے آگے ہمارا سرِ تسلیم خم ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی عطا ہے۔ ع "ہرچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است" میرے اس پیالے میں میرے ساقی نے جو کچھ ڈال دیا یہ اس کی نگاہ کرم ہی کے طفیل ہے' یہ اس کا عطیہ ہے' لہٰذا دل و جان سے قبول ہے۔

آگے فرمایا:

﴿اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَرَحۡمَۃٌ﴾

"یہ ہیں وہ لوگ کہ جن پر ان کے رب کی طرف سے عنایتیں ہیں اور رحمت ہے"۔

صلوٰۃ ــ بندے اور رب کے مابین دو طرفہ معاملہ

یہاں لفظ "صَلَوَات" بھی خاص طور پر توجہ کے لائق ہے۔ یہ صلوٰۃ کی جمع ہے اور اس سے قبل یہ لفظ ہمارے اس منتخب نصاب میں سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات کے درس میں آچکا ہے: ﴿وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ﴾ ... "صلوٰۃ" جیسا کہ عرض کیا گیا تھا' توجہ کا نام ہے۔ لغت میں اس کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے: "اِقدام الی الشَّیء" یعنی کسی کی جانب متوجہ ہو جانا' کسی کی طرف رخ کرلینا۔ اسی لئے نماز جس کی اصل روح ہے اللہ کی جانب متوجہ ہو جانا' اس کا آغاز ان الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے: ﴿اِنِّیۡ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ﴾

صلوٰۃ درحقیقت ایک دو طرفہ عمل ہے جو اللہ اور بندے کے مابین ہے۔ بندہ جذبۂ عبودیت کے ساتھ اپنے رب کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور پروردگار شفقت و عنایت کے ساتھ بندے کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ ذہن میں رکھئے کہ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر عبد و معبود کے ربط و تعلق کو ایک دوہرے اور دو طرفہ تعلق کی شکل میں سامنے لایا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ ہی میں اس مقام سے متصلاً قبل کہ جو ہمارے زیر درس ہے' یہ آیت موجود ہے: ﴿فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ اَذۡکُرۡکُمۡ وَاشۡکُرُوۡا لِیۡ وَلَا تَکۡفُرُوۡنِ۝﴾ "پس تم مجھے یاد رکھو' میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر بجالاؤ اور میری ناشکری نہ کرو!" اس کی بڑی عمدہ وضاحت ایک حدیث مبارکہ سے ہوتی ہے جس کی رو سے آپؐ نے فرمایا کہ اگر میرا بندہ مجھے اپنے جی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور اگر میرا بندہ میرا ذکر کسی محفل میں کرتا ہے تو اس سے بہت اعلیٰ محفل میں (یعنی ملائکہ مقربین کی محفل میں) اس کا ذکر کرتا ہوں"۔ اسی طرح کا معاملہ لفظ توبہ کا بھی ہے۔ بندہ رجوع کرتا ہے اللہ کی جناب میں پشیمانی اور احساسِ ندامت کے ساتھ گناہ کے راستے سے

واپس پھرتا ہے اور اللہ بھی بندے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اپنی شفقتوں اور عنایتوں کے ساتھ۔ گویا اس کی وہ نگاہ کرم جو بندے کی جانب سے ہٹ گئی تھی وہ اب پھر اس کی طرف ملتفت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح "نصرت" کا معاملہ بھی دو طرفہ ہے : ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ﴾ "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔" یہ صریحاً ایک دو طرفہ معاملہ ہے۔ اسی طرح شکر کے بھی دو رخ ہیں۔ اللہ بھی شکور ہے اور بندے کے لئے بھی شکور کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بندے کا شکور ہونا اس معنی میں کہ وہ اللہ کا حق مانے' اس کا احسان مانے اور اس کی نعمتوں کا حق ادا کرے' اور اللہ اس اعتبار سے شکور ہے کہ وہ کوششوں اور قربانیوں کی قدر افزائی فرمانے والا ہے' وہ بڑا قدردان ہے۔ تو ذہن میں رکھئے کہ کچھ اسی طرح کا معاملہ صلوٰۃ کا بھی ہے۔ بندہ اگر اللہ کی طرف متوجہ ہو گا تو اللہ بھی بندے کی طرف کمال شفقت کے ساتھ متوجہ ہو جائے گا۔ سورۃ الاحزاب میں نبی اکرم ﷺ کی شان میں جو الفاظ وارد ہوئے وہ چونکہ بالعموم سیرت کی ہر تقریر کا عنوان بنتے ہیں' لہٰذا اکثر لوگوں کو یاد ہیں کہ :

﴿اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ' یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۝﴾

یہاں دیکھئے کہ "صلوٰۃ" کی نسبت اللہ اور فرشتوں کی طرف ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجتے ہیں' ان کی جانب سے آپؐ پر شفقتوں اور عنایتوں کا مسلسل نزول ہو تا رہتا ہے' لیکن نوٹ کیجئے کہ یہ الفاظ صرف نبی اکرم ﷺ کے لئے نہیں آئے بلکہ سورۃ الاحزاب ہی میں بعینہٖ یہی الفاظ اہل ایمان کے لئے بھی استعمال ہوئے ہیں :

﴿ھُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ' وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا۝﴾

"وہی ہے اللہ جو (اے اہل ایمان) تم پر عنایتیں بھیجتا رہتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تم پر عنایتیں (درود) بھیجتے ہیں' تاکہ وہ تمہیں نکالے اندھیروں میں سے روشنی کی جانب' اور وہ اہل ایمان کے حق میں بہت ہی رحیم ہے۔"

یہ ہے لفظ صلوٰۃ کا قرآن حکیم میں استعمال! — یہاں فرمایا : ﴿اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ

صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ﴾ اللہ کی عنایات اور شفقتوں کا نزول ان لوگوں پر ہوتا ہے جو مشکلات اور آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے والے ہیں' جنہوں نے دین کو محض موروثی عقائد اور چند رسومات کا عقیدہ سمجھ کر قبول نہیں کیا بلکہ شعوری طور پر حقائق کو سمجھا' فرائضِ دینی کا شعور حاصل کیا' دین کی دعوت پر لبیک کہا' جنہوں نے اس حقیقت کو جانا کہ دین کے لئے جان و مال کا کھپانا اور اس کے غلبہ و اقامت کے لئے قربانیوں کا دینا ہمارے ایمان کا عین تقاضا ہے اور پھر اس راہ کے تمام امتحانوں اور آزمائشوں میں پورے اترے' یہ ہیں وہ لوگ جن پر ان کے رب کی جانب سے عنایتیں ہیں' جن کے لئے شاباشیں ہیں' جن پر اللہ کی رحمتوں کا مسلسل نزول ہوتا رہے گا۔ اور فرمایا: ﴿ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ "اور یہی ہیں وہ لوگ جو راہ یاب ہونے والے ہیں" جو ہدایت یافتہ ہیں۔ نوٹ کیجئے کہ یہاں پھر اسلوبِ حصر ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ صرف یہی لوگ فی الواقع راہ ہدایت پر گامزن ہیں۔

اس سے قبل سورۃ الفاتحہ کے درس کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ہدایت کے مختلف مدارج ہیں۔ ایک انسان درجہ بدرجہ ہدایت کی منزلیں طے کرتا ہے۔ ایک منزل کے بعد اگلی منزل ہے اور ایک مرحلے کے بعد دوسرا مرحلہ ہے۔ گویا ہدایت ایک مسلسل عمل ہے۔ چنانچہ لفظ ہدایت کا اطلاق اپنے تکمیلی معنوں میں کسی کے منزل مراد تک پہنچ جانے کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ اس پہلو سے ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ کا مفہوم ہوگا: "یہ ہیں وہ لوگ جو منزل مراد تک پہنچ جانے والے ہیں"۔

ان چند آیات میں اہل ایمان کو مدنی دور کے بالکل آغاز میں جن مراحل سے سابقہ پیش آنے والا تھا ان کے بارے میں پیشگی طور پر متنبہ کر دیا اور ساتھ ہی مسلمانوں کو بحیثیت امتِ مسلمہ شہادت علی الناس کا جو فرضِ منصبی سونپا گیا تھا اس کے ضمن میں ہمیشہ ہمیش کے لئے یہ رہنمائی عطا کر دی گئی کہ جو مرتبہ و مقام تمہیں ملا ہے اس کے تقاضے کے طور پر بات جان لو کہ اس راہ میں مصائب و مشکلات آئیں گی' آزمائشوں میں سے تمہیں گزرنا ہوگا۔ اس لئے کہ ع "جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے۔"

حکمِ قتال اور اس کا ہدف

یہ بات ذہن میں رکھئے کہ سورۃ البقرہ مدنی سورۃ ہے اور اس کے زمانہ نزول کا اگر تعین کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہجرت کے بعد سے لے کر غزوۂ بدر سے متصلاً قبل تک کے عرصے میں نازل ہوئی۔ چنانچہ یہ آیات جو ہمارے زیر درس ہیں گویا کہ قتال فی سبیل اللہ کے لئے تمہید کا درجہ رکھتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اسی سورۂ مبارکہ میں آگے چل کر چوبیسویں رکوع میں قتال فی سبیل اللہ کے ضمن میں متعین حکم بھی موجود ہے : ﴿ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ﴾ حکم ہو گیا کہ اے اہل ایمان اب اللہ کی راہ میں قتال کرو' اور جان لو کہ تمہاری دعوت اب اگلے مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ الحج میں' جو نزولی اعتبار سے سورۃ البقرۃ سے متصلاً قبل شمار کی جاتی ہے' اذنِ قتال والی آیت آئی ہے۔ ذہن میں رکھئے کہ قتال کی اجازت اور قتال کا حکم' دو مختلف چیزیں ہیں۔ اجازتِ قتال یہ ہے کہ اب تمہیں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہو گئی :

﴿ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ ﴾

یعنی آج اجازت مرحمت کی جا رہی ہے ان لوگوں کو جن پر جنگ ٹھونسی گئی تھی' جن پر مظالم توڑے گئے تھے' جنہیں ان کے گھر بار سے نکالا گیا تھا' جن پر زندگی کا قافیہ تنگ کیا گیا تھا' لیکن جنہیں اب تک اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ تھی' گویا ان کے ہاتھ باندھ دیئے گئے تھے' جیسا کہ سورۃ النساء میں ایک جگہ فرمایا گیا کہ ان سے کہہ دیا گیا تھا : ﴿ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ ﴾ (اپنے ہاتھ بندھے رکھو' جھیلو اور برداشت کرو' جس کے لئے ان دروس میں بار بار PASSIVE RESISTANCE کا لفظ استعمال ہوا ہے) آج ان کے ہاتھ کھول دیئے گئے اور انہیں اجازت دے دی گئی کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت کی نوید بھی دے دی گئی کہ اللہ تعالیٰ ان کی

مدد پر قادر ہے۔ ﴿وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ﴾ اس کے بعد سورۃ البقرہ میں حکمِ قتال وارد ہوا :

"وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ"

"جو لوگ تم سے جنگ کر رہے ہیں اب تم ان سے جنگ کرو اللہ کی راہ میں۔"

سورۃ البقرہ کے چوبیسویں رکوع میں جہاں قتال کا یہ حکم آیا ہے وہاں ساتھ ہی اس کا ہدف بھی معین کر دیا گیا :

﴿وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ﴾

"اور ان سے جنگ کرتے رہو (یہ تلواریں جو اَب میان سے نکلی ہیں یہ اب میان میں واپس نہیں جائیں گی) جب تک کہ فتنہ بالکل فرو نہ ہو جائے (اللہ کے باغی جب ہتھیار نہ ڈال دیں) اور پورا نظامِ اطاعت اللہ ہی کے لیے نہ ہو جائے۔"

جب تک اللہ کی زمین پر اسی کا حکم نافذ نہیں ہوتا اور اس کا کلمہ سربلند نہیں ہوتا اس وقت تک جنگ جاری رہے گی۔ گویا قتال فی سبیل اللہ کا ہدف یہ ہے کہ دین کُل کا کُل اللہ کے لئے ہو جائے' اسی کا جھنڈا سربلند ہو' اسی کی مرضی نافذ ہو' اسی کے حکم کی تنفیذ ہو' مختصراً یہ کہ اللہ کی زمین پر اللہ ہی کا دین قائم ہو جائے۔ بہرکیف یہ ہے قتال کا باضابطہ حکم جو سورۃ البقرہ کے چوبیسویں رکوع میں آیا ہے۔

اب ذرا ایک نظر سورۃ البقرہ کی آیت ۲۱۴ پر بھی ڈال لیجئے جس کا حوالہ اس سے پہلے سورۃ العنکبوت کے پہلے رکوع کے درس میں دیا جا چکا ہے۔ یہ بات سمجھ لیجئے کہ کسی بھی نظریاتی گروہ یا جماعت میں ہر مزاج اور ہر افتادِ طبع کے لوگ ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی جماعت میں جہاں کثیر تعداد میں ایسے باہمت لوگ تھے کہ جنہوں نے حکمِ قتال کی آیت کے نزول پر خوشیاں منائیں کہ اب ہمارے ہاتھ کھول دیئے گئے' اب ہمارے لئے دین کی راہ میں سرفروشی کا وقت آگیا اور ہمیں اب شہادت کے مواقع نصیب ہوں گے' وہاں کچھ وہ بھی ہوں گے کہ جن پر کچھ گھبراہٹ طاری ہوئی ہو گی۔ جن کے لئے یہ نیا مرحلہ جس میں جنگ و قتال سے سابقہ تھا' شاید زیادہ ہی کڑی آزمائش بن گیا ہو۔ ایسے لوگوں سے صاف کہہ دیا گیا : ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ﴾ "کیا تم نے یہ گمان کیا تھا کہ تم

(سیدھے سیدھے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے" ﴿وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ "حالانکہ ابھی تو تم پر وہ حالات آئے ہی نہیں (وہ آزمائشیں' وہ کٹھنائیاں اور وہ مشکلات ابھی آئیں ہی نہیں) کہ جو تم سے پہلی امتوں کو پیش آئے تھے" ﴿مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا﴾ "فقر وفاقہ اور تکالیف ان پر مسلط ہوئیں اور وہ ہلا مارے گئے" ﴿حَتّٰى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ﴾ "یہاں تک کہ (وقت کے) رسولؐ اور ان کے ساتھی اہل ایمان پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی! (تب انہیں خوشخبری سنائی گئی) آگاہ رہو کہ اللہ کی مدد قریب ہی ہے"۔ اور اس کے ایک ہی آیت کے بعد مسلمانوں سے فرمایا گیا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ﴾ "تم پر یہ قتال فرض کر دیا گیا (یہ دعوت آج اپنے اگلے مرحلے میں داخل ہو گئی) اور یہ تمہیں ناپسند ہے" تم پر یہ حکم بڑا بھاری گزر رہا ہے ﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ "اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو در آنحالیکہ اسی میں تمہارے لئے بہتری ہو۔" ﴿وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـــًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ﴾ "اور ہو سکتا ہے کہ کسی چیز سے تمہیں محبت ہو (وہ تمہیں پسند ہو) در آنحالیکہ فی الواقع وہ تمہارے لئے شر ہو" ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ "اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

ایک آخری بات یہ عرض کرنی ہے کہ یہاں اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کا چونکہ بحیثیت مجموعی بھی ایک تجزیہ عرض کیا گیا ہے لہٰذا اسی حوالے سے یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ اسی سورۂ مبارکہ میں آگے چل کر تاریخ بنی اسرائیل کی اس اہم جنگ کا تفصیلاً ذکر آیا ہے جسے ان کی تاریخ میں جنگِ بدر کے قائم مقام سمجھا جا سکتا ہے جس کے بعد کہ ان کے دنیوی اقتدار اور جاہ و جلال کے دور کا آغاز ہوا۔ یہ جنگ طالوت اور جالوت کے مابین ہوئی جس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کا وہ عہدِ حکومت ہے جسے بجا طور پر تاریخ بنی اسرائیل کا زریں دور قرار دیا جاتا ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ میں اس اہم تاریخی واقعے کا ذکر در اصل مسلمانوں کو متنبہ کرنے کے لئے ہے کہ اب وہی مرحلہ تمہاری تاریخ

(باقی صفحہ ۷۹ پر)

حسابِ کم و بیش

یعنی

امیر تنظیمِ اسلامی،
داعی تحریک خلافت پاکستان،
وصدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد

کے بعض ذاتی و خاندانی، اور مالی و معاشی کوائف

ان کے اپنے قلم سے!

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

وَمَا اَسْئَلُكُمْ
عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ
اِنْ اَجْرِيَ اِلاَّ عَلَى
رَبِّ الْعَالَمِيْنَ
(القرأن)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

ویسے تو یہ بات پہلے بھی بہت مرتبہ ذہن میں آئی' لیکن اس سال رمضان مبارک میں دورۂ ترجمہ قرآن کے دوران جب بھی یہ الفاظِ مبارکہ سامنے آئے کہ:

"میں تم سے اس کی (یعنی اپنی تعلیم و تلقین' دعوت و تبلیغ' اور نصح و خیر خواہی کی) کوئی اجرت طلب نہیں کرتا۔ میرا اجر تو بس اللہ کے ذمے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے!" (واضح رہے کہ یہ الفاظ بعض دوسرے مقامات کے علاوہ صرف سورۂ شعراء میں پانچ مرتبہ وارد ہوئے ہیں!) تو دل میں یہ پختہ ارادہ پیدا ہوا کہ باطن کا معاملہ تو اللہ ہی کے حوالے ہے' چونکہ کم از کم ظاہری حد تک میں نے بھی اپنی پوری زندگی دین کی دعوت و خدمت ہی میں بسر کی ہے' لہٰذا مناسب ہے کہ اپنی زندگی کے کم از کم اِس دعوتی دور کے مالی معاملات کا "حسابِ کم و بیش" پبلک کے سامنے پیش کردوں تاکہ ایک عربی شعر۔

"اُحِبُّ الصّالحینَ و لستُ منهم
لعلّ اللّٰهَ یَرزُقنی صَلاحا"

کے مصداق واضح ہو جائے اور اس کا "تَحدیثًا لِلنِّعمَة" ذکر بھی ہو جائے کہ گو "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک" کے مطابق دوسرے اعتبارات سے تو کوئی نسبت مجھے اصحابِ ہمّت و عزیمت کے ساتھ حاصل نہیں ہے' تاہم اس خاص معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے' خواہ لاکھ بلکہ کروڑ میں ایک ہی کے تناسب سے سہی' بہرحال یہ نسبت اپنے اس بندۂ ناچیز کو عطا کردی ہے کہ اس خدمتِ دین کو دولت کمانے' یا جائیداد بنانے' یا اثاثے جمع کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا۔

موجودہ دور میں اس معاملے کی اہمیت پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ "پبلک لائف" سے تعلق رکھنے والے اکثر و بیشتر لوگوں کا معاملہ خواہ وہ اہلِ سیاست و حکومت ہوں' خواہ رجالِ دین و مذہب' عوام کے لئے بہت سی بدگمانیوں کا موجب بن رہا ہے۔ چنانچہ جب لوگوں کے علم میں آتا ہے کہ صرف قومی و سماجی خدمت کرنے والے ہی نہیں' عبا و قبا اور جُبّہ و دستار کے حاملین بھی "اس حمام میں سب ننگے ہیں!" اور "چوں دُم برداشتم مادہ بر آمد" کے مصداقِ کامل ہیں تو فطری طور پر عوام میں شدید ردِّ عمل پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں مخلص اور نیک نیت لوگوں کے کام میں بھی رکاوٹ پیش آتی ہے۔ بنا بریں ضروری ہے کہ جیسے اربابِ سیاست و حکومت سے عام طور پر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے سیاسی کیریئر سے قبل اور بعد کے اثاثوں کا اعلان کریں' ایسے ہی لازم ہے کہ خادمانِ دین و مذہب بھی اپنا "حسابِ آمد و خرچ" لوگوں کے سامنے پیش کر دیں۔ تاکہ بدگمانی کی عمومی فضا ختم ہو اور اعتماد کی صورت بحال ہو جائے۔

محاسبۂ اخروی کے اہم اور اساسی امور کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ سے متعدد ہم مضمون احادیث مروی ہیں جن میں سے ایک کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

﴿لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمُرِهٖ فِيمَا اَفْنَاهُ' وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيمَا اَبْلَاهُ' وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيمَا اَنْفَقَهٗ' وَمَاذَا عَمِلَ فِيمَا عَلِمَ﴾ (ترمذیؒ عن عبداللہ ابن مسعودؓ)

ترجمہ: "کسی انسان کے قدم قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے سے ہل نہیں سکیں گے جب تک کہ اس سے پانچ باتوں کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کر لی جائے: (i) عمر کے بارے میں کہ کس کام میں صرف کی؟ (ii) خصوصاً عہدِ شباب کے بارے میں کہ وہ کہاں بتایا؟ (iii) اور (iv) مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کن کاموں میں خرچ کیا؟ اور (v) جو علم حاصل

ہوا اس میں عمل کتنا کیا؟"

تو اگرچہ پوری زندگی کے بارے میں تو میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا، اس لئے کہ معلوم نہیں ہے کہ ابھی اس کا کتنا حصہ باقی ہے، اور اس بقیہ حصے کے بارے میں اللہ ہی کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ مبادا "وَلٰکِنَّہٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ" (الاعراف : ۱۷۶) کی صورت بن جائے اور، معاذ اللہ، اگلا پچھلا کیا دھرا سب اکارت ہو جائے، تاہم الحمد للہ کہ عہدِ شباب کے بارے میں پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اللہ کے فضل وکرم سے، اپنی ساری ذاتی خامیوں اور کوتاہیوں، اور جملہ "عجز" اور "کسل" کے باوجود ع "جنوں میں جتنی بھی گزری بہ کار گزری ہے!" کے مصداق نوجوانی کی عمر سے لے کر کہولت کی عمر تک کا پورا زمانہ اللہ کے دینِ حق، اور بالخصوص اس کی کتابِ عزیز کی خدمت ہی میں بسر ہوا!

رہا علم اور اس کے مطابق عمل کا معاملہ، تو اس کے ضمن میں اولاً تو "عصمتِ بی بی است از بے چادری!" کے مطابق اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ "معلومات" کے بارِ گراں سے بچائے ہی رکھا ہے، البتہ حضرت بُلّھے شاہ کے اس شعر کے مصداق کہ ۔ "عِلموں بس کریں او یار۔ اِکّو الف ترے درکار!" دین کے اصول و مبادی کا جو فہم اللہ نے دیا، بحمد اللہ اس پر کم از کم ناگزیر حد تک عمل کی توفیق بھی خود ہی اپنے خصوصی فضل وکرم سے ارزانی فرمادی۔ فَلَہُ الْحَمْدُ وَالْمِنَّۃ!

البتہ جہاں تک مالی امور کے بارے میں سوالات کا تعلق ہے یعنی یہ کہ کیا اور کن ذرائع سے کمائی کی اور کہاں اور کس طور سے خرچ کیا، تو اس کے تیس سال کے لگ بھگ عرصے کا تفصیلی حساب کتاب تو ظاہر ہے کہ دنیا میں تو ممکن ہی نہیں ہے، رہا آخرت کا معاملہ تو اگرچہ وہاں پائی پائی کا حساب تو یقیناً محفوظ ہو گا لیکن خیریت اور عافیت میں صرف وہی رہ سکیں گے جن سے "حسابِ یسیر" لیا جائے۔ چنانچہ اسی پر قیاس کرتے ہوئے ایک "موٹا حساب" آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

چونکہ ہر وہ شخص جو لوگوں کو قرآن حکیم کا درس دیتا ہے' یا وعظ و خطاب کی کوئی اور صورت اختیار کرتا ہے' اس کی حیثیت لامحالہ ایک "داعی" کی سی ہو جاتی ہے' بنا بریں میری زندگی کے "دعوتی دور" کا آغاز اصلاً تو اٹھارہ برس کی عمر میں ۱۹۵۰ء ہی سے ہو گیا تھا' تاہم آزادانہ حیثیت میں دعوتِ دین اور خدمتِ قرآن کا سلسلہ ۱۹۶۵ء سے شروع ہوا۔ جو پہلے چھ برس یعنی ۷۱ء تک خالص انفرادی جدوجہد کی صورت میں جاری رہا' تا آنکہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس (مارچ ۱۹۷۲ء) سے اس میں اجتماعی رنگ کا آغاز ہوا' جو تین سال بعد یعنی مارچ ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کے قیام کے ساتھ اپنی پوری پختگی کو پہنچ گیا۔ لہٰذا "دعوتی دور" کے مالی معاملات کے ضمن میں "حسابِ کم و بیش" بھی اصولی طور پر اس کے بعد کے زمانے ہی سے متعلق ہے۔

تاہم اس سے پہلے کا اجمالی خاکہ بھی حاضرِ خدمت ہے' یعنی :

(i) پیدائش (۲۶/اپریل ۱۹۳۲ء) سے ۱۹۴۷ء میں میٹرک پاس کرنے تک پوری کفالت والد صاحب مرحوم نے فرمائی۔

(ii) ۴۷ء تا ۵۴ء ایف ایس سی اور میڈیکل کی تعلیم کے دوران کچھ بار والد صاحب نے برداشت کیا' کچھ تعاون بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کا رہا' کچھ مدد میرٹ سکالرشپ سے ملتی رہی (الحمد للہ کہ ایف ایس سی اور میڈیکل کالج کے فرسٹ ایئر کے دوران بھی میں "وظیفہ خوار" تھا' پھر میڈیکل کالج کے سیکنڈ ایئر کے دوران تو میرے پاس دو دو سکالرشپ تھے' ایک ایف ایس سی کی اساس پر' اور دوسرا فرسٹ ایئر کے امتحان میں فرسٹ آنے پر!) مزید برآں اس زمانے میں بعض اداروں سے قرض حسنہ بھی حاصل کیا جو تعلیم سے فراغت کے بعد ادا کیا۔

(iii) ۵۴ء سے ۵۷ء تک تین سال جماعت اسلامی منٹگمری (حال ساہیوال) کی ڈسپنسری میں ملازمت کی اور پھر ۵۷ء تا ۶۲ء اپنی ذاتی پریکٹس کی' جس کی بنا پر انکم ٹیکس

دہندگان میں تو شمار ہونے لگا، تاہم مالی حیثیت لوئر مڈل کلاس ہی کی رہی۔

(iv) ۶۲ء تا ۶۵ء لگ بھگ تین سال بھائیوں کے ساتھ ایک کاروباری اشتراک میں گزرے، اور اس دوران میں رہائش، سواری اور دیگر سہولتیں بھی مرفہ الحال طبقے کی سی میسر رہیں اور عام رہن سہن بھی کم از کم اپر مڈل کلاس کا رہا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کچھ نقد پونجی بھی جمع ہو گئی۔

ان سطور کی تحریر کے وقت (۹ مئی ۹۴ء) میری عمر شمسی حساب سے باسٹھ برس اور بارہ یوم ہو چکی ہے۔ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ ع "کچھ ترے آنے سے پہلے، کچھ ترے جانے کے بعد" کے مصداق میری زندگی کے پورے تیس سال متذکرہ بالا کاروبار میں شرکت سے قبل بسر ہوئے تھے، اور ٹھیک تیس ہی سال اس سے علیحدگی کے بعد ہو گئے ہیں۔ اور یہ "شراکت مع الاِخوان" میری زندگی میں نہ صرف زمانی اعتبار سے "مرکزی" حیثیت کی حامل ہے بلکہ متعدد دیگر اعتبارات سے بھی بہت "فیصلہ کن" ثابت ہوئی۔ چنانچہ اسی کے نتیجے میں میں نے دوبارہ لاہور منتقل ہو کر اپنی آزادانہ حیثیت میں اور بھرپور طور پر زندگی کے "دعوتی دور" کا آغاز کیا۔ اور، جیسے کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، اسی کے ذریعے مجھے اپنی زندگی کے نئے دور کے لئے لازمی ابتدائی سرمایہ حاصل ہوا۔ بنا بریں میری زندگی کے دعوتی دور کے مالی معاملات کے صحیح فہم کے لئے اس کاروباری اشتراک کا صغریٰ کبریٰ اور اس کے ضمن میں وَصل و فصل کے بنیادی حقائق کے مختصر تذکرے کے ساتھ ساتھ برادرانِ بزرگ و خورد کا اجمالی تعارف بھی ضروری ہے۔

اس سلسلے میں اِس وقت مجھے یہ سہولت حاصل ہے کہ اب سے چھ سال قبل اپنے "بعض ذاتی اور خانگی کوائف" پر مشتمل میری ایک تحریر ماہنامہ "میثاق" میں تین اقساط میں (جولائی تا ستمبر ۸۸ء) شائع ہوئی تھی۔ جس کا فوری سبب تو یہ تھا کہ

برادرم اقتدار احمد نے اپنے ذاتی ہفت روزہ جریدے "ندا" کے دسویں شمارے میں میرے بارے میں چند جملے ایسے شائع کئے جن سے پرانی یادوں کے بہت سے دریچے وا ہو گئے اور اپنی خاندانی زندگی کے بہت سے بھولے بسرے واقعات کی فلم پردۂ ذہن پر چلنے لگی اور یہ احساس شدت کے ساتھ پیدا ہوا کہ یہ حقائق و واقعات تنظیم اسلامی کے رفقاء و احباب کے علم میں آنے ضروری ہیں۔ اس لئے کہ "بیعت" کی بنیاد پر قائم ہونے والی تنظیم میں داعی کی زندگی کے اہم حالات و واقعات کا "مبایعین" کے علم میں ہونا مناسب اور مفید ہی نہیں' ضروری ہے۔ تاہم جب میں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تو ایک تو بات بہت طویل ہوتی چلی گئی۔ اور دوسرے ع "اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں!" کے مصداق بعض "ناگفتنی" باتوں کا تذکرہ بھی ناگزیر ہو گیا۔ بنابریں میں خود تو اس کی اشاعت کے بارے میں متردّد ہو گیا تھا' لیکن تنظیم اسلامی کے بہت سے سینئر اور ذمہ دار رفقاء کا خیال ہوا کہ اس کی اشاعت ضروری ہے۔ تاہم جب وہ تحریر شائع ہونی شروع ہوئی تو اس کے بعض جملوں پر جو میرے نزدیک تو صرف لطیف مزاح کے حامل تھے' بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کی جانب سے شدید رنج و غم کا اظہار ہوا۔ بنابریں وہ سلسلہ وہیں روک دیا گیا۔

اُس وقت اس تحریر کی تسوید کا فوری سبب تو واقعتاً وہی بات بنی تھی جو اوپر بیان ہوئی۔ لیکن اس کا ایک دوسرا اور عملی اعتبار سے اہم تر محرک' جسے میں نے اُس وقت صریحاً بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا' یہ تھا کہ انہی دنوں متعدد گوشوں سے یہ بات سننے میں آئی تھی کہ لوگوں میں عام طور پر یہ چرچا ہے کہ ڈاکٹر اسرار کی تحریک کی اصل سرپرستی اور مالی معاونت' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس کے اپنے ذاتی مصارف اور گذر بسر کا ذریعہ بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کا "تعاون" ہے۔ گویا معاملہ وہ بن رہا تھا جس کی "لفظی تصویر" سورۂ آل عمران کی آیت ۱۸۸ میں وارد شدہ ان الفاظ میں سامنے آتی ہے کہ: "اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا" یعنی: "ان کی تعریف کی

جائے ایسے کاموں پر جو انہوں نے کئے ہی نہیں!" — جبکہ واقعہ یہ تھا کہ ۷۰ء کے بعد سے لے کر اس تحریر کی تسوید تک ہی نہیں' آج تک بھی' بھائی اظہار کا ایک پیسے تک کا تعاون مجھے ذاتی اعتبار سے' یا میری تحریک اور تنظیم کو اجتماعی سطح پر حاصل نہیں ہوا۔ بیس برس سے زائد عرصے پر محیط اس "قاعدہ کلیہ" میں صرف دو استثناءات ہیں' اور وہ بھی اختیاری نہیں جبری (i) ایک یہ کہ جس دور میں اظہار لمیٹڈ کے مینجنگ ڈائریکٹر برادرم اقتدار احمد بن گئے تھے' اس زمانے میں انہوں نے اپنے اختیارِ خصوصی سے یکمشت ایک لاکھ روپے کی اعانت بھی مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی کی تھی' اور بھائی اظہار کو بھی "جبراً" انجمن کا ممبر بنوا دیا تھا' جس کا "ماہانہ چندہ" ان کی جانب سے بعد میں بھی آتا رہا۔ اور (ii) ایک خاص مرحلہ پر جب اللہ تعالیٰ نے انہیں کاروبار میں غیر معمولی نفع عطا کیا تھا' انہوں نے اپنے غریب بھائیوں اور بہنوں کو ایک ایک لاکھ روپے کی "خیرات" تقسیم کی تھی' جس کی پیشکش مجھے بھی کی گئی تھی — بلکہ والدہ صاحبہ مکرمہ کے ہاتھوں وہ رقم مجھ تک پہنچا بھی دی گئی تھی — لیکن الحمدللہ کہ میں نے اسے ع "غیرتِ فقر مگر کرنہ سکی اس کو قبول" کے مصداق رد کر دیا تھا۔ اور جو رقم والدہ صاحبہ کے جذبات کے لحاظ کی بنا پر ان کے دستِ شفقت سے "وصول" کر لی تھی بھائی اظہار کو "باعزت" طور پر واپس کر دی تھی۔ اور یہ اس لئے کہ چونکہ انہوں نے میرے مشن میں شرکت اور شمولیت اختیار نہیں کی تھی' لہٰذا یہ ان کا خالص "ذاتی تعاون" تھا جسے میری "غیرتِ فقر" نے گوارا نہیں کیا۔

اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ ۷۲ء-۷۱ء کے بعد سے جو مالی تعاون بھی' خواہ ذاتی سطح پر' خواہ تنظیم و تحریک یا انجمن کی سطح پر' بھائیوں میں سے کسی سے مجھے حاصل ہوا' وہ صرف برادرم اقتدار احمد کی جانب سے تھا۔ بہت بعد میں اس میں اضافہ برادرِ عزیز وقار احمد کے تعاون کی صورت میں ہوا۔ گویا اگر وضاحت نہ کر دی جاتی تو جو کریڈٹ فی الحقیقت برادرم اقتدار احمد کا حصہ تھا' وہ بالکل ناجائز اور ناروا طور پر بھائی

اظہار کو مل رہا تھا۔ چنانچہ اس تحریر سے پیش نظر یہ تھا کہ "حق بحقدار رسید" والا معاملہ ہو جائے اور لوگوں کو اصل حقیقت کا علم حاصل ہو جائے — یہ دوسری بات ہے کہ ابھی یہ مقصد صرف "نفی" کی حد تک ہی حاصل ہوا تھا، یعنی اس کی تو وضاحت ہو گئی تھی کہ جو عارضی اور وقتی "جبری" تعاون بھائی اظہار کی طرف سے ۶۹-۱۹۶۸ء کے دوران مجھے حاصل رہا تھا اس کا سلسلہ اوائل ۷۰ء ہی میں منقطع ہو گیا تھا — لیکن ابھی "اِثبات" کی نوبت نہیں آئی تھی یعنی "حق بحقدار رسید" والا معاملہ نہیں بنا تھا اور برادرم اقتدار کے تعاون کا تذکرہ شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ تحریر کا سلسلہ رک گیا اور بات ادھوری ہی رہ گئی۔

اس "بین الاخوانی" معاملے کے علاوہ اس تحریر کا ایک اور مقصد بھی تھا جو ع "جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے!" کے مصداق بقیہ تمام "اسباب" سے "عظیم تر" تھا، اور وہ تھا خدائے بزرگ و برتر، اور ربِّ عظیم و اکبر، اور اس کے ایک حقیر اور ناچیز بندے کے مابین تعلق کا معاملہ یا صحیح تر الفاظ میں ع "چوں معاملہ نہ دارد، سخن آشنا نہ باشد!" کے مصداق اللہ اور اس کے ایک بندے کے مابین "معاملے" کی بات! جس کی کسی قدر وضاحت ضروری ہے۔

انسان کی دنیوی زندگی کا اصل مقصد از روئے قرآن "امتحان و ابتلاء" ہے، جس کے بہت سے مراحل اور مدارج ہیں (جن کا ایک حسین پیرائے میں بیان، بحمد اللہ، راقم کے قلم سے "حج اور عید الاضحیٰ" کے موضوع پر تحریر میں حضرت ابراہیمؑ کے تذکرے کے ضمن میں ہوا ہے!)--- چنانچہ اس کا ایک درجہ اور مرحلہ وہ ہے جس کا ذکر سورۂ انفال میں "وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا" (آیت ۱۷) کے الفاظِ مبارکہ میں ہوا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بسا اوقات اپنے بندوں کو ایسے امتحانات سے دوچار کر دیتا ہے کہ اگر وہ ہمت کر کے ان سے کامیابی کے ساتھ گزر جائیں (اور یہ

ہمت بھی اسی کی عطا کردہ ہوتی ہے) تو اس سے ان میں ایک جانب اللہ پر توکل میں اضافہ ہو جائے، اور دوسری جانب کسی قدر "خود اعتمادی" بھی پیدا ہو جائے! میرے ساتھ ایک ایسی ہی صورت ۷۰ء میں شدت کے ساتھ پیدا ہو گئی تھی جس سے فروری ۷۱ء میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے خصوصی فضل و کرم کے طفیل کامیابی سے گزار دیا۔

میری چار برس قبل کی اس تحریر میں، جو اس کتابچے میں باب دوم کی حیثیت سے شامل ہے، پوری تفصیل بیان ہو چکی ہے کہ ۷۰ء میں میں اپنی صحت اور مالی حالت دونوں کے اعتبار سے کس قدر سخت آزمائش سے دوچار ہو گیا تھا، اور ایک جانب دنیا اور اس کی ضروریات، اور حالات و واقعات کے تلخ اور سنگین حقائق، اور دوسری جانب دین اور مقصدِ حیات کے مشکل اور کٹھن تقاضوں کے مابین شیکسپیئر کے الفاظ "To be or not to be is the question" میں بیان شدہ کیفیت کس شدت کے ساتھ پیدا ہو گئی تھی ـــــ یہ امتحان، ظاہر بات ہے کہ، ہرگز اس درجہ سخت اور شدید نہ ہوتا اگر بھائیوں میں سے کسی کا بھی کوئی تعاون اُس وقت مجھے حاصل ہوتا! چنانچہ اسی کی جانب میں نے اپنی اس تحریر میں بھی ایک سے زائد مقامات پر اشارہ کیا ہے (اگرچہ صراحت اب کر رہا ہوں) یعنی برادرم اقتدار احمد سے پانچ چھ سال کی "مغائرت" اور بھائی اظہار کی جانب سے تعاون کا "انقطاعِ کُلی" ظاہری اسباب اور ان کے اپنے ارادوں اور نیتوں اور محرکاتِ عمل سے قطع نظر، اصلاً "منجانب اللہ" تھا۔ اور میرے پروردگار نے مجھے اس فیصلہ کن سوال سے اس حالت میں دوچار کیا تھا کہ عالمِ اسباب میں کسی بھی تعاون اور مدد کا کوئی محسوس سہارا موجود نہ تھا۔ اور بحمد اللہ و بفضلہٖ میں نے اُس وقت جو فیصلہ کیا وہ اسی کی عطا کردہ توفیق سے صرف اور صرف اسی کی ذات پر "توکّل" کی بنیاد پر تھا "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ"۔ "ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ تانہ بخشد خدائے بخشندہ!"

چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کی اسی سنتِ ابتلاء کے ابدی قوانین کا مظہر ہے کہ جیسے ہی میں فروری ۷۱ء میں حج کے موقع پر "آخری فیصلہ" کر کے واپس آیا' مسائل اور مشکلات کے بادل چھٹنے شروع ہو گئے اور صوفیاء کرام کی اصطلاح میں "فتوحات" کا سلسلہ اور قرآن حکیم کے الفاظ مبارکہ "وَوَجَدَکَ عَائِلًا فَاَغْنٰی" کا انعکاس شروع ہو گیا— چنانچہ زیر حوالہ تحریر کا اہم ترین "مقصد" یہ تھا کہ اپنے نوجوان ساتھیوں اور صُلبی اور معنوی بیٹوں کے سامنے یہ حقیقت کھول کر بیان کر دوں تاکہ زندگی کے آئندہ مراحل میں اگر وہ بھی کبھی کسی ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہو جائیں تو ہمت نہ ہاریں اور اولوالعزم انبیاء و رسل علیہم السلام اور صلحاء و اتقیاء رحمہم اللہ کی سیرتوں کے علاوہ مجھ ایسے ناتواں اور ناچیز کی "آپ بیتی" سے بھی حوصلہ پا سکیں!

بہرحال "مَاشَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَالَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ" کے مطابق اُس وقت تو اس تحریر کا معاملہ نامکمل رہ گیا تھا۔ لیکن "عَلٰی اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ" (القمر: ۱۲) کے مصداق اور "کُلُّ شَیْءٍ مَرْھُوْنٌ لِوَقْتِہٖ" (الحدیث) کے مطابق لگ بھگ چار سال بعد اس کی تکمیل کا سبب پیدا ہو گیا۔ اور وہ اس طرح کہ ایک جانب بڑے بھائی اظہار احمد صاحب اور ان کے صاحبزادوں' اور دوسری جانب چھوٹے بھائی اقتدار احمد اور ان کے بیٹوں کے مابین کچھ کاروباری مخاصمت پیدا ہو گئی جس نے بعض دوسرے عوامل کے ساتھ مل کر "بین الاخوانی" تعلقات میں تلخی کا شدید زہر گھول دیا۔ ادھر بھائی اظہار صاحب کو ایک تو خود مجھ سے بھی بعض صحیح یا غلط شکایات تھیں' دوسرے ان کا خیال یہ بنا کہ میں برادرم اقتدار احمد کی ناجائز طرف داری سے کام لیتا ہوں۔ بنابریں انہوں نے ۵ راگست ۱۹۹۲ء کو ایک جذباتی دباؤ کی کیفیت میں ایک نہایت زہریلی تحریر میرے اور عزیزم اقتدار احمد کے خلاف لکھ کر اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں (نامعلوم تعداد میں) بہت سے اعزّہ و اقارب' یہاں تک کہ بعض کاروباری احباب کو بھی بھیجوا دیں۔

اس پر چار و ناچار' اور واقعتاً بادلِ ناخواستہ مجھے بھی قلم اٹھانا پڑا جس کی تمہید ان الفاظ سے ہوئی:

۱۔ میرے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب نے جو تحریر میرے اور برادرم اقتدار احمد کے بارے میں حال ہی میں سپردِ قلم کر کے بعض اقارب و احباب کو پہنچائی ہے' اس نے مجھے "گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل" کے شش و پنج اور گومگو میں مبتلا کر دیا ہے۔

۲۔ اس لئے کہ اگر میں خاموش رہتا ہوں تو اسے ان کے الزامات کو درست ماننے کے مترادف سمجھا جائے گا۔ اور اگر جواب دیتا ہوں تو حقائق و واقعات کے ساتھ ساتھ ان کے پس منظر حتیٰ کہ نیتوں اور محرکاتِ عمل کا معاملہ بھی لازماً زیرِ بحث آتا ہے (جس کی ابتداء انہوں نے تو بانگِ دہل کر بھی دی ہے)۔ اور اس طرح بہت سے نئے اور پرانے گندے کپڑوں کے برسرِ عام دھلنے کی صورت پیدا ہو گی۔

۳۔ میں پہلی ہی صورت اختیار کر لیتا اور یہ خطرہ بھی مول لے لیتا کہ نہ صرف بعض اقرباء اور احباب بلکہ میرے اپنے بچے بھی میرے بارے میں سُوءِ ظن میں مبتلا ہو جائیں (اس لئے کہ متنازعہ واقعات ان کے سنِ شعور سے قبل کے زمانے سے متعلق ہیں)---- لیکن چونکہ میری ذات کے ساتھ ایک انجمن' ایک تنظیم' اور ایک تحریک کا معاملہ بھی وابستہ ہے' اور ع "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں ا" کے مصداق ان کی اس تحریر کا حملہ ان سب کی عزت اور وقار پر ہوا ہے---- لہٰذا تقریباً دس روز کے گہرے غور و فکر کے بعد میں نے مجبوراً قلم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

لیکن اس کے بعد جب قلم چلنا شروع ہوا تو اتنے مواد کی تسوید ہو گئی کہ عام کتابی سائز کے دو سو صفحات میں بمشکل سما سکے۔ اسی طرح برادرم اقتدار احمد نے جو جوابی تحریر تیار کی وہ میری تحریر سے بھی لگ بھگ دوگنی تھی۔ (ان تحریروں کے بارے میں ایک وضاحت

"پس نوشت" کے عنوان سے اس پیش لفظ کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں) تاہم میری اس تحریر کا صرف قدرِ قلیل حصہ میرے مالی اور معاشی معاملات سے متعلق تھا۔ اگرچہ اس کے ذریعے چار سال قبل کی تحریر میں جو کمی رہ گئی تھی بحمد اللہ اس کی تکمیل ہو گئی۔

چنانچہ صفحاتِ آئندہ میں حسب ذیل حصے شامل کئے جا رہے ہیں :

اولاً جولائی ۸۸ء میں شائع شدہ قسط بہ تمام و کمال (اس لئے کہ اس میں ہمارے بین الاخوانی علائق اور تحریکِ اسلامی کے ساتھ تعلق کے آغاز کے ضمن میں تمہیدی امور شامل ہیں جو اس تحریر کی اشاعت کے مقصد کے اعتبار سے لازمی ہیں)۔

ثانیاً: اگست اور ستمبر ۸۸ء میں شائع شدہ اقساط میں سے صرف متعلق حصہ۔ (جو کل تحریر کے ثُلث سے بھی کم ہے۔ اور اس میں سے بھی وہ جملے حذف کر دیئے گئے ہیں جو ۸۸ء میں بھائی اظہار صاحب کو ناگوار گزرے تھے۔) اور

ثالثاً: اگست ستمبر ۹۲ء میں تحریر شدہ طویل وضاحتی بیان کا صرف وہ قدرِ قلیل حصہ جو میری زندگی کے اصل اور شعوری دعوتی دور کے "حسابِ کم و بیش" پر مشتمل ہے۔ اور جو' جیسے کہ آغاز میں عرض کیا گیا تھا' اس تحریر کی اشاعت کے اصل مقصد کے اعتبار سے اہم ترین ہے۔

واضح رہے کہ یہ آخری حصہ ۱۰/ ستمبر ۱۹۹۲ء کو سپردِ قلم ہوا تھا' جس پر اب لگ بھگ ڈیڑھ سال بیت چکا ہے۔ اور اس عرصے کے دوران بعض حالات میں جزوی تبدیلی بھی رونما ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں مناسب طریق یہ نظر آیا ہے کہ ۹۲ء کی تحریر تو جوں کی توں شائع ہو' البتہ حواشی کے ذریعے اسے آج کی تاریخ تک UPDATE کر دیا جائے۔

ضمناً عرض ہے کہ بھائی اظہار احمد صاحب کے ساتھ تلخی اپنی انتہاء کو پہنچ کر ۱۲/ دسمبر ۹۳ء کو اچانک طور پر اس طرح ختم ہو گئی کہ ان کی جانب سے ہمارے بہنوئی اللہ بخش سیال صاحب حسب ذیل تحریر لے کر آئے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرے ماں جائے بھائیو۔۔السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،

کافی دنوں سے ہماری آپس میں بول چال بند ہے۔ اس کی وجہ ہماری تحریریں ہیں۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ اپنی تحریر میں بعض باتیں غیر شعوری طور پر مجھ سے غلط لکھی گئی تھیں۔ اور جواباً آپ دونوں بھائیوں نے بھی اپنی تحریروں میں میرے ساتھ زیادتیاں کی ہیں۔ میں اپنی تحریر کو بالکلیہ واپس لیتا ہوں اور ساتھ ہی لوجہ اللہ آپ کو معاف کرتا ہوں اور آپ سے بھی متوقع ہوں کہ آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔ اس سے بقول نبی اکرم ﷺ ہمارے والدین کی ارواح کو بھی تسکین ہوگی۔

بھائی اللہ بخش سیال صاحب اور عزیزم ڈاکٹر ابصار احمد کی کوششیں لائقِ صد تحسین ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ آمین والسلام

تمہارا بڑا بھائی اظہار احمد عفی عنہ"

بھائی اظہار صاحب کی اس تحریر پر ان کے فرزندِ اکبر عزیزم ایوب صابر کی بھی حسب ذیل EDNDORSEMENT موجود تھی:

"محترم جناب بڑے چچا و محترم جناب اقتدار چچا

السلام علیکم!

میں محترم ابی جان کے شعوری اور غیر شعوری تسامحات پر معذرت خواہ ہوں۔

والسلام آپ کا بھتیجا ایوب صابر"

چنانچہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔۔۔ اور اب یہ خیال ہوتا ہے کہ جیسے غزوۂ احزاب کے موقع پر کفر کی ساری یلغار کا مقصدِ وحید صرف اہلِ ایمان کے لئے ایک شدید آزمائش کی صورت پیدا کر دینا تھا، اسی طرح ہمارے مابین یہ ساری تلخی صرف اس لئے پیدا

ہوئی تھی کہ میری وہ تحریر جو ۸۸ء سے نامکمل پڑی تھی تکمیل کا مرحلہ طے کر لے!

بہرحال اب یہ "حسابِ کم و بیش؟!" انجمن خدام القرآن کے وابستگان' تنظیم اسلامی کے رفقاء اور تحریکِ خلافت کے معاونین اور دیگر جملہ احباب و متعلقین کی خدمت میں ع "سپردم بہ تو مایۂ خویش را!" کی صورت میں پیش ہے۔ اگر یہ راہِ حق کے کسی ایسے مسافر کو جو حالات کی ظاہری ناموافقت کے باعث گھبرا رہا ہو از سرِ نو کمرِ ہمت کسنے پر آمادہ کر سکے تو شاید کہ یہ میری نجات کا ذریعہ بن جائے۔ فقط

خاکسار

اسرار احمد

لاہور۔ ۹ رمئی ۱۹۹۴ء

پس نوشت

میری اور برادرم اقتدار احمد کی جوابی اور وضاحتی تحریریں' ظاہر ہے کہ' اشاعتِ عام کے لئے تو تھیں ہی نہیں' البتہ یہ خیال ضرور تھا کہ بھائی اظہار صاحب سے ان لوگوں کی فہرست حاصل کر لی جائے جنہیں انہوں نے اپنی الزامی تحریر ارسال کی تھی تاکہ ہم بھی اپنی تحریریں انہیں بھجوا دیں۔ لیکن بوجوہ بھائی اظہار صاحب نے ہمیں وہ فہرست فراہم نہیں کی۔ چنانچہ ہم نے اپنے بیانات اپنی اولاد کے علم میں لانے کے علاوہ قریب ترین اعزّہ میں سے بھی صرف ان کو پہنچائے جن کے بارے میں ہمیں صراحت کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ بھائی اظہار کی تحریر ان تک پہنچی ہے۔ ان پر مستزاد راقم نے بھائی اظہار صاحب کی الزامی تحریر اور اپنا وضاحتی بیان ع "آں را کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک؟" کے مصداق تنظیم اسلامی کے مرکزی ناظمین کو بھی پڑھوا دیئے تاکہ ان کے علم میں آجائے کہ ان کے "امیر" پر اس کے بڑے بھائی نے کیا الزامات عائد کئے ہیں اور اس کے پاس ان کا کیا جواب ہے —— بعد میں جب بھائی اظہار صاحب نے اپنا پورا بیان ہی واپس لے لیا تو بحمد اللہ پورا معاملہ رفع دفع ہو

گیا اور لگ بھگ ڈیڑھ سال تک جاری رہنے والی ذہنی کوفت اور قلبی اذیت کا خاتمہ ہو گیا ـــــ تاہم صرف ایک بھائی کے ہاتھوں جو کیفیت مجھ پر بیتی اس سے مجھے حضرت یوسف علیہ السلام کے اس ابتلاء اور امتحان کی شدت کا ہلکا سا اندازہ ہو گیا جو ایک نہیں دس بھائیوں کے بغض و عداوت، اور عناد و شقاق کی بنا پر "آنجناب" کو پیش آیا تھا۔ بہر حال یہ تو ع "جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے" اور ع "دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر" والا معاملہ ہے۔ مجھ ایسے کمزور انسان کے لئے تو یہی بہت ہے کہ رحمتِ خداوندی نے "اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ" (سورۂ یوسف: آیت ۱۰۰) کے بعد جلد ہی "اِنْ کُنَّا لَخٰطِئِیْنَ" (آیت ۹۱) والی صورت پیدا فرما دی۔ فلہُ الحمد۔!

امتحانات سے فارغ طلبہ کے اوقات کا بہترین مصرف۔

قرآن حکیم سے استفادہ ـــ بذریعہ خط و کتابت کورسز

اپنی نوعیت کے دو منفرد خط و کتابت کورسز میں داخلہ جاری ہے

۱۔ قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی
پر مبنی کورس جو بذریعہ کیسٹس کرایا جاتا ہے

۲۔ عربی گرائمر خط و کتابت کورس
جس میں عربی گرائمر جدید خطوط پر پڑھائی جاتی ہے

داخلہ

کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس اور دیگر تفصیلات کے لیے درج ذیل پتہ پر رابطہ کریں۔

شعبۂ خط و کتابت کورس
قرآن اکیڈمی، ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ فون ۵۔۸۵۶۰۰۳

باب اوّل

تحریکی اور "بین الاخوانی" پس منظر

(شائع شدہ "میثاق" جولائی ۱۹۸۸ء)

ہمارے خاندان کا مولانا مودودی مرحوم کی تصانیف اور ان کی دعوت و تحریک سے اولین تعارف بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کے ذریعے ہوا۔ جنہوں نے اپنی انجینئرنگ کی تعلیم کے دوران جماعت اسلامی کے لٹریچر کو نہ صرف پڑھ لیا تھا' بلکہ اپنی محنتی طبیعت کے مطابق اس کے مفصل نوٹس تیار کر کے گویا اسے اچھی طرح ہضم بھی کر لیا تھا ـــــ ۱۹۴۷ء کے وسط میں وہ تعلیم سے فارغ ہوئے' اور پھر تین چار ماہ تقسیمِ ہند کے حوادث سے دوچار رہنے کے بعد اسی سال کے اواخر میں ایک جانب محکمہ نہر میں ایس ڈی او کے عہدے پر فائز ہو گئے ـــــ اور دوسری جانب جماعت اسلامی کے رکن بن گئے!

جماعت سے تعلق کے ضمن میں ان کے ساتھ ایک عجیب حادثہ یہ پیش آیا کہ جب حکومت نے جماعت اسلامی کو سیاسی جماعت قرار دے کر سرکاری ملازمین کے لئے اس کی رکنیت ممنوع کر دی تو انہوں نے اپنی ذاتی اور خاندانی مجبوریوں کے باعث رکنیت سے استعفاء دے دیا ـــــ لیکن ۱۹۵۱ء میں جب جماعت نے پنجاب کے انتخابات میں زور شور سے حصہ لیا تو وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکے اور انہوں نے اپنی ذاتی کار انتخابی مہم میں استعمال کے لئے جماعت کے حوالے کر دی' جس کی پاداش میں وہ سرکاری ملازمت سے برخواست کر دیئے گئے! ـــــ بعد ازاں شدید محنت و مشقت اور اپنی فنی مہارت و قابلیت کے بل پر اپنی آزاد معیشت کو استوار کرنے کے بعد وہ دوبارہ جماعت کے رکن بنے تو اس بار جماعت کی پالیسی اور طریق کار کے ضمن

میں جو شدید اختلاف ۵۷-۱۹۵۶ء میں رونما ہوا تھا اس کا شکار ہو گئے اور نہایت مایوس اور بد دل ہو کر دوبارہ علیحدہ ہو گئے اور اس بار ان کی مایوسی اور بد دلی اتنی شدید تھی کہ انہوں نے باضابطہ استعفاء تحریر کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی!

وہ دن اور آج کا دن' ان کی جملہ صلاحیتیں اپنے فن اور کاروبار کے لئے وقف ہو کر رہ گئیں ـــــ اور اگرچہ پالیسی کے اختلاف کے ضمن میں ان کی رائے صد فی صد راقم کی رائے کے مطابق تھی' چنانچہ اجتماع ماچھی گوٹھ میں جو چند ووٹ راقم کو ملے تھے ان میں سے ایک ان کا بھی تھا ـــــ لیکن اس کے بعد ان میں تحریکی داعیہ دوبارہ کبھی پیدا نہ ہو سکا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر ایک بار پھر ان کے جذبات میں ایک عارضی سا ابال آیا تھا جس کی بنا پر انہوں نے جماعت اسلامی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کی ایک نشست کے لئے بڑے جوش و خروش اور جذبہ و شوق کے ساتھ حصہ لیا تھا۔ لیکن انتخابات کے نتائج نے انہیں پہلے سے بھی زیادہ مایوس اور بد دل کر دیا ـــــ چنانچہ کچھ اسی مایوسی اور بد دلی' اور کچھ بعض دوسرے اسباب و عوامل کے باعث وہ راقم کی دعوت و تحریک کے ساتھ' اس سے نظری طور پر بہت حد تک متفق ہونے کے باوجود' تا حال عملاً منسلک نہیں ہو پائے!

یہ بھی یقیناً راقم پر اللہ تعالیٰ کے عظیم فضل و احسان کا مظہر ہے کہ اس کے باقی تینوں حقیقی بھائی' واحد حقیقی چچازاد بھائی سمیت' اس کے مشن میں عملاً شریک و شامل اور تنظیم اسلامی سے باضابطہ منسلک ہیں۔

ان میں سب سے چھوٹے یعنی ڈاکٹر ابصار احمد سے رفقائے تنظیم و انجمن' اور قارئینِ "میثاق" و "حکمت قرآن" بخوبی واقف ہیں' اس لئے کہ وہ تنظیم اسلامی میں باضابطہ شامل ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن اکیڈمی کے اعزازی ڈائریکٹر اور "حکمتِ قرآن" کے اعزازی مدیر بھی ہیں۔

عمر میں ان سے بڑے ہمارے واحد عم زاد مظفر احمد منور ہیں جو کراچی یونیورسٹی کے انتظامی شعبے سے منسلک اور تنظیم اسلامی کراچی سے وابستہ ہیں۔ کچھ عرصہ قبل تک وہ نہایت فعال کارکن تھے — لیکن اولاً اپنی والدہ مرحومہ کی شدید اور طویل علالت' پھر اپنی اہلیہ کی ناسازیٔ طبع اور پھر اپنے ایک چھوٹے بچے کی پریشان کن علالت کے باعث اگرچہ زیادہ فعال نہیں رہے[1] — تاہم نظم کی پابندی میں ہرگز کوئی کوتاہی نہیں کرتے!

ان سے بڑے یعنی برادرم وقار احمد اگرچہ نہایت کم گو ہونے کے باعث زیادہ نمایاں نہیں ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ چوالیس پینتالیس برس کی عمر میں' جوان بچوں کے باپ اور دو نواسوں کے نانا ہونے کے باوجود' اور ایک معروف تعمیراتی فرم کے ڈائریکٹر اور کاروباری اعتبار سے نہایت مصروف ہونے کے باوصف انہوں نے جس طالب علمانہ شان کے ساتھ قرآن اکیڈمی کا دو سالہ تعلیمی کورس امتیازی حیثیت میں مکمل کیا' وہ ان کی سعادت' دین کے ساتھ لگن اور راقم کے مشن کے ساتھ گہری وابستگی کا بیّن ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے ان کی زبان کا "عقدہ" کھول دے اور ان کی طبیعت کی جھجک دور فرمادے تو ان شاء اللہ وہ قرآن حکیم کے درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کے میدان میں نہایت نمایاں خدمت سرانجام دے سکیں گے۔ (جس کا آغاز انہوں نے' بحمد اللہ' اپنے بچوں اور بچیوں کو عربی زبان اور ترجمۂ قرآن کی تدریس کی صورت میں کر بھی دیا ہے۔)

ان میں سب سے بڑے' — اور مجھ سے متصلاً چھوٹے ہیں مدیر "ندا" برادرم اقتدار احمد' جن کے ساتھ حقیقی بھائی ہونے کے اساسی رشتے پر مستزاد راقم کے چار مزید رشتے قائم ہو چکے ہیں' یعنی ان کی دو بچیاں میرے دو بیٹوں کے گھروں کی زینت

---

[1] افسوس کہ بعد میں یہ غیر معمولی طور پر ذہین اور ہونہار بچہ بھی انہیں داغ مفارقت دے گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ہیں[1] اور میری دو بچیاں ان کی بہوئیں ہیں، لیکن ان جملہ رشتوں سے اہم تر معاملہ یہ ہے کہ وہ میرے نہایت دیرینہ معاون اور رفیق کار ہیں تحریک اسلامی کے ساتھ ان کا تعلق بھی تقریباً اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود میرا!

چنانچہ جن دنوں راقم میڈیکل اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے اسلامی جمعیت طلبہ کا فعال کارکن تھا، وہ بھی ہائی اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے سرگرم کار تھے۔ اور ۵۱۔۱۹۵۰ء کی انتخابی مہم میں بھی انہوں نے انتھک کام کیا تھا — اور دسمبر ۱۹۵۱ء کی اُس دس روزہ تربیت گاہ میں بھی شرکت کی تھی جو راقم نے بحیثیت ناظم جمعیت لاہور منعقد کی تھی اور جس کے نہایت دور رس اثرات خود راقم کی شخصیت اور بعد کی زندگی کے رخ پر مترتب ہوئے تھے!

۱۹۵۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد کچھ خاندانی حالات اور زیادہ تر ذاتی نفسیاتی الجھنوں کے باعث نہ صرف یہ کہ ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا بلکہ کچھ عرصہ وہ نہایت شدید نفسیاتی بحران کا شکار رہے۔ راقم کو نہایت شدت کے ساتھ احساس تھا کہ ان کی نفسیاتی الجھنوں کے پیدا ہونے میں کچھ حصہ الفاظِ قرآنی "اِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ" (سورۂ ص : ۲۴) اور فارسی مقولے "سگ باش برادرِ خورد مباش!" کے مصداق ہم بڑے بھائیوں — بالخصوص راقم کا بھی تھا۔ لہٰذا راقم نے اس کی تلافی اور ان کی دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کی اور ان ہی مساعی کے سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم و مغفور کے ساتھ اپنے ذاتی مراسم اور رسوخ کو بروئے کار لا کر مولانا محمد ایوب صاحب کی صاحب زادی سے ان کی شادی کا اہتمام کیا۔ (مولانا ان دنوں سردار صاحب کے یہاں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے تھے اور جماعت اسلامی کے ساتھ فعال

---

[1] ان میں ایک مزید اضافہ حال ہی میں ہوا ہے جب میرے سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی بھی ان ہی کی سب سے چھوٹی صاحبزادی سے ہو گئی۔

وابستگی رکھتے تھے۔) اور بحمد اللہ اس کے نہایت صحت مند نتائج ظاہر ہوئے ـــــ اور نہ صرف یہ کہ آں عزیز کی زندگی کی گاڑی صحیح پٹڑی پر پڑ گئی بلکہ پھر انہوں نے اپنی تعلیمی کمی کی بھی بھرپور تلافی کی ـــــ اور گیارہ ماہ کے اندر اندر تین امتحان پاس کر لئے' اولاً ادیب فاضل' پھر ایف اے اور پھر بی اے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے لاہور کا رخ کیا اور ایک جانب اسلامیہ کالج سول لائن میں ایم اے انگلش کے لئے اور دوسری جانب لاء کالج میں ایل ایل بی میں داخلے کے لئے آزمائشی ٹیسٹ دیئے' اور دونوں میں کامیابی حاصل کر کے بالفعل داخلہ ایل ایل بی میں لے لیا ـــــ اور اس کے ساتھ ساتھ اولاً ڈیڑھ دو ماہ روزنامہ "تسنیم" اور بعد ازاں ہفت روزہ "ایشیا" میں کام کرنا شروع کر دیا اور مؤخر الذکر کے سلسلے میں تو اتنی کامیابی حاصل کر لی کہ ملک نصر اللہ خاں مرحوم و مغفور نے اپنی آپ بیتی پر مشتمل ایک کالم کے سوا باقی پورا پرچہ ان کے حوالے کر دیا۔ اور انہوں نے بھی چھ ماہ کے اندر اندر اس کی اشاعت میں معقول اضافہ کر کے دکھا دیا۔

اُس وقت تک اللہ تعالیٰ نے بھائی جان کی شدید محنت اور مشقت کے صلے میں ان کے کاروبار میں برکت عطا فرما دی تھی اور ان کی تعمیراتی فرم کا کام کافی وسعت اختیار کر گیا تھا' جس کے لئے انہیں معاون ہاتھ درکار تھے۔ چنانچہ ان کی دعوت پر عزیزم افتخار احمد نے بقولِ خود قلم ہاتھ سے رکھ کر بیلچہ تھام لیا۔ اور الحمد للہ کہ اس میدان میں بھی ان کی طبعی ذہانت نے جلد ہی اپنا لوہا منوا لیا۔ بعد میں بھائی جان نے ان کے' اور ان سے چھوٹے بھائی عزیزم وقار احمد کے لئے جنہوں نے بی ایس سی کا امتحان پاس کر لیا تھا' پرائیویٹ ٹیوشن کے ذریعے سول انجینئرنگ کی تعلیم کا اہتمام بھی کر دیا۔ جس کے نتیجے میں انہیں اس کاروبار کے ضمن میں عملی مہارت کے ساتھ ساتھ فنی بصیرت بھی حاصل ہو گئی ـــــ اور اس طرح یہ دونوں چھوٹے بھائی پیشہ اور کاروبار کے اعتبار سے مستقلاً اس "شاہراہ" پر گامزن ہو گئے جس کا "افتتاح" بھائی جان نے کیا تھا!

اس دوران میں خود راقم الحروف ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی کی رکنیت اور جماعت کی ڈسپنسری کی ملازمت کو خیرباد کہنے کے بعد از سرِنو اپنی معاشی زندگی کی بنیاد استوار کرنے اور تحریکی وابستگی کی نئی راہیں متعین کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ چنانچہ تین چار سال کی محنت کے نتیجے میں ایک جانب اس نے منٹگمری (حال ساہیوال) میں اپنا ذاتی مطب مستحکم (ESTABLISH) کرلیا تھا اور دوسری جانب کچھ عرصہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے "بزرگوں" کے کوچوں کا طواف کرنے، اور بالآخر کسی نئی تعمیر و تشکیل کے ضمن میں ان سے مایوس اور بددل ہو جانے کے بعد، ذاتی سطح پر منٹگمری ہی میں "حلقہ مطالعۂ قرآن" اور "دارالقامہ" کے نام سے ایک ہاسٹل کے قیام کے ذریعے اپنے مقصدِ زندگی کی لگن اور تحریکی جذبے کی تسکین کا سامان فراہم کرلیا تھا۔ اس ہاسٹل کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ کالج میں زیرِ تعلیم طلبہ کے لئے دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ اور الحمدللہ کہ برادر عزیز مظفر احمد منور اور برادرم ڈاکٹر ابصار احمد کے فکر و نظر کی داغ بیل اسی ہاسٹل میں پڑی اور ان کی زندگی کا رخ یہیں متعین ہوا۔

میں اپنی ان مصروفیات میں پوری طرح مگن اور مطمئن تھا کہ اچانک بھائی جان کی جانب سے مجھے بھی اپنے کاروبار میں شرکت کی دعوت موصول ہوئی، خود اپنے بارے میں اس "اعتراف" کے ساتھ کہ "میرے پاس فنی صلاحیت اور مہارت تو موجود ہے، تنظیمی اور انتظامی صلاحیت بالکل نہیں ہے" اور میرے بارے میں اس "مغالطے" کے باعث کہ "تمہیں اللہ نے یہ صلاحیتیں وافر مقدار میں عطا کی ہیں!" ـــــ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک جانب والدین سے بھی سفارش کرائی اور دوسری جانب خود مجھ پر ترپ کا یہ پتہ آزمایا کہ "تم اپنی میڈیکل پریکٹس کے ساتھ دعوت اور تحریک کا کام کیسے کرسکو گے؟ بہتر یہ ہے کہ کچھ دن اس کاروبار میں وقت لگا کر اس کے انتظامی ڈھانچے کو استوار کردو، پھر ہم تمہیں دین کے کام کے لئے مستقل طور پر "فارغ" کردیں۔

گے!" ـــــ تحریک اسلامی کے ساتھ میری شدید جذباتی وابستگی نے مجھے اس دلیل کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا ـــــ اور میں نے بھی ان کی دعوت قبول کر لی۔ چنانچہ میں قریشی کنسٹرکشن کمپنی لمیٹڈ کا حصہ دار بھی بن گیا' اور اس کا ڈائریکٹر اور جنرل مینیجر بھی! اور میرے ذاتی مطب نے بھی اسی کمپنی کی جانب سے ایک خیراتی ہسپتال (WELFARE CLINIC) کی حیثیت اختیار کر لی۔

لیکن جلد ہی راقم نے محسوس کر لیا کہ یہ تو "دام ہم رنگِ زمین" ہے' اس لئے کہ اولاً یہ کام جس قدر محنت اور توجہ کا طالب ہے اس کے پیش نظر اندیشہ ہے کہ کہیں میں مستقل طور پر اسی میں "گم" ہو کر نہ رہ جاؤں ـــــ مزید بر آں یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ اعلیٰ معیارِ زندگی کی بیڑیاں پاؤں میں مستقل طور پر نہ پڑ جائیں' ثانیاً ہم دونوں بھائیوں کے مزاج اور اندازِ کار کا فرق قدم قدم پر پیچیدگیوں کا باعث بن رہا تھا' جس سے فوری طور پر ذہنی کوفت اور وقت اور صلاحیت کے ضیاع کے علاوہ یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ کہیں مستقبل کے اعتبار سے لینے کے دینے نہ پڑ جائیں کہ کہاں تو مقصد یہ تھا کہ احیائے اسلام کے لئے مشترک جدوجہد کریں گے کہاں یہ کہ باہمی اخوت کا رشتہ بھی مجروح ہو جائے!

بنا بریں' میں نے کاروبار میں شرکت کے بعد جلد ہی واپسی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن چونکہ یہ پورے خاندان کا مسئلہ بن گیا تھا اور اس میں ہم چار بھائیوں کے علاوہ ایک بہنوئی بھی شامل تھے لہٰذا اس شراکت کو ختم کرنے میں کچھ وقت لگا ـــــ اور اگرچہ اس کے دوران بھائی جان مجھے ہر طرح سمجھاتے رہے کہ میں علیحدگی اختیار نہ کروں لیکن میرا حال یہ تھا کہ اس "دام ہمرنگِ زمین" سے نکلنے میں مجبوراً جو تاخیر ہو رہی تھی اس کا ایک ایک لمحہ سوہانِ روح بن گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار بھائی جان نے فرمایا: "اسرار تم ذرا محنت کر لو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم ہشتم خاں سے بڑے کنٹریکٹر بن سکتے ہو۔" (یہ نام میں نے تو پہلی بار ان ہی کی زبان سے سنا تھا' لیکن بعد میں

معلوم ہوا کہ یہ صاحب کوئی کروڑ پتی قسم کے ٹھیکیدار تھے۔) جس کا جواب میں نے یہ دیا تھا کہ "بھائی جان مجھے یہ کام کرنا ہی نہیں ہے۔ مجھے اگر پیسہ ہی بنانا مقصود ہوتا تو اللہ نے جو "پیشہ" مجھے عطا فرمایا تھا (یعنی میڈیکل پریکٹس) وہ بھی کچھ ایسا برا نہ تھا!"

بہرحال راقم ۱۹۶۵ء میں کراچی سے رسی تڑا کر (جہاں ۶۲ء میں اسی کاروبار کے سلسلے میں منتقل ہو گئی تھی اور جہاں مزارِ قائداعظم کے قریب اس کوٹھی میں قیام رہا تھا جس میں بعد میں پیپلز پارٹی کا سنٹرل سیکرٹیریٹ قائم ہوا) سیدھا لاہور پہنچا' اس لئے کہ ع "کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے!" کے مصداق کسی انقلابی دعوت و تحریک کا آغاز ملک کے کسی "اُمّ القریٰ" ہی سے ہو سکتا تھا--- اور اُس وقت میں نے اپنی زندگی کے اس عجیب و غریب حادثے پر نگاہِ بازگشت ڈالی تو یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ الفاظ قرآنی "لَقَدْ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یٰمُوْسٰی" کے مصداق اس پورے معاملے میں یہ حکمتِ خداوندی اور مشیتِ ایزدی مضمر تھی کہ مجھے ساہیوال سے اکھاڑ کر لاہور لے آیا جائے--- اور یہاں اپنی زندگی کے نئے سفر کے آغاز کے لئے ابتدائی سرمایہ بھی فراہم کر دیا جائے۔

چنانچہ کاروبار سے علیحدگی پر جو خطیر رقم میرے حصے میں آئی' اس سے میں نے:
(۱) ایک دو منزلہ مکان کرشن نگر لاہور میں خریدا جس میں اتنی گنجائش موجود تھی کہ رہائشی ضروریات بھی پوری ہو جائیں' اور مطب بھی قائم ہو سکے'۔
(۲) "دارالاشاعت الاسلامیہ" قائم کیا جس کے تحت سب سے پہلے میری اپنی تالیف "تحریکِ جماعتِ اسلامی' ایک تحقیقی مطالعہ" شائع ہوئی' اور پھر مولانا امین احسن اصلاحی کی تصانیف اور تفسیر "تدبر قرآن" --- اور میرے ابتدائی دعوتی کتابچوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ (۳) ماہنامہ "میثاق" جاری کیا' جو کچھ عرصے سے بند تھا' چنانچہ اس کے ضمن میں کچھ سابقہ واجبات بھی مجھے ادا کرنے پڑے!

الغرض' اس طرح مجھے اپنی زندگی کے اس نئے سفر کے آغاز میں کوئی دقت نہیں

ہوئی' جس کے اہم نشاناتِ راہ ہیں: ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس' اور اس کے تحت قرآن اکیڈمی کا قیام --- اور ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کی تاسیس اور اس عنوان کے تحت اقامتِ دین کی ایک انقلابی جدوجہد کا آغاز!

انگریزی زبان کے ایک مشہور مقولے[1] کا حاصل یہ ہے کہ علیحدگیاں ہمیشہ تلخیوں کو جنم دیتی ہیں — ہماری کاروباری علیحدگی بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ نہ رہ سکی' اور بھائی جان کے ضمن میں تو وہ صورت پوری شدت کے ساتھ پیدا ہو کر رہی جس کا اندیشہ میری علیحدگی کے اسباب میں داخل تھا۔ چنانچہ ان کے ساتھ ایک طویل عرصے تک تعلقات نہایت کشیدہ رہے۔ خود عزیزم اقتدار احمد کے ساتھ اگرچہ کوئی براہ راست تلخی تو پیدا نہیں ہوئی' لیکن غیر محسوس طور پر مغائرت کے پردے حائل ہوتے چلے گئے۔ (اور اس میں بھی' جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم حکمت مضمر تھی!)

ہماری کاروباری علیحدگی جس انداز میں ہوئی' اس کے نتیجے میں برادرم اقتدار احمد کو ایک مستحکم کاروباری ادارے کے مالک و مختار ہونے کی حیثیت حاصل ہو گئی' اور اس طرح ان کی ذہانت اور صلاحیت کو بھرپور طور پر بروئے کار آنے کا موقع ملا۔ اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اپنی خداداد لیاقت اور شدید محنت و مشقت کے نتیجے میں نہایت شاندار کامیابی حاصل کی اور اس میدان میں فتح و کامرانی کے بہت سے بلند اور نمایاں جھنڈے نصب کئے۔ (اور اس کے نتیجے میں ہماری معاشی سطح میں جو نمایاں فرق و تفاوت پیدا ہوا' اس نے ہمارے مابین مغائرت کے پردوں کو مزید دبیز کر دیا!)

---

[1] "PARTINGS ARE ALWAYS PAINFUL

سنہ ۱۹۶۵ء تا سنہ ۱۹۷۱ء

دعوت و تبلیغ کی خالص انفرادی مساعی

کے دوران

معاش اور معاد کی شدید کشاکش

اور بالآخر

خالصۃً توکلاً علی اللہ

میڈیکل پریکٹس کو خیرباد کہنے کا

آخری فیصلہ

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ

الطلاق : ۳

(شائع شدہ "میثاق" اگست و ستمبر سنہ ۱۹۸۸ء)

اواخر ۶۵ء سے اواخر ۷۰ء تک پانچ سال کا عرصہ راقم کی زندگی کا مصروف ترین اور شدید ترین مشقت کا دور تھا' جس کے دوران مختلف ہی نہیں متضاد قسم کی مصروفیات کا شدید دباؤ راقم پر رہا۔

یادش بخیر' محنت و مشقت کی شدت کے اعتبار سے ان ایام کا مقابلہ اگر کسی درجہ میں کر سکتے ہیں تو صرف ۵۰ء تا ۵۳ء کے وہ تین چار سال جو اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ انتہائی فعال وابستگی میں گزرے تھے' اور جن کے دوران اولاً میڈیکل کالج کی نظامت' پھر لاہور اور پنجاب کی دوہری نظامت اور بالآخر پورے پاکستان کی نظامتِ علیا کا بوجھ راقم کے کندھوں پر رہا تھا۔

شدید مشقت کے اس دورِ ثانی (۶۵ء تا ۷۰ء) کی مصروفیات کا کسی قدر اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ:

ایک جانب مطب کی مصروفیت تھی جس میں صبح سے شام تو ہوتی ہی تھی' اس پر مزید یہ کہ چونکہ رہائش اور مطب یکجا تھے' لہٰذا رات کا آرام بھی یقینی نہ تھا۔ اور اکثر "تہجد بالمرضیٰ" کی صورت پیش آتی رہتی تھی۔

دوسری جانب "حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن" تھے جو لاہور کے مختلف گوشوں میں قائم تھے اور جن سے ہفتے کی کوئی شام مستثنیٰ نہ تھی۔ ان میں سے جو حلقے دور دراز کے علاقوں میں قائم تھے وہ تو مریضوں کی یلغار سے محفوظ رہتے تھے' لیکن جو دو حلقے خود کرشن نگر میں قائم تھے ان کے ضمن میں تو اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ادھر میں درس دے رہا ہوتا تھا اور ادھر دروازے پر مریض یا ان کے لواحقین منتظر ہوتے تھے۔ شام کے ان دروس پر مستزاد تھا جمعہ کا خطبہ و خطاب اور اتوار کی صبح کا مرکزی درسِ قرآن! گویا ہفتے کا کوئی پورا دن تو کجا' دن کا کوئی حصہ بھی آرام کے لئے مختص نہ تھا!

تیسری جانب تحریر و تسوید کا کام تھا' جس میں "میثاق" کے اداریوں کے علاوہ اپنے دعوتی مضامین اور کتابچوں کی تالیف بھی شامل تھی۔

اور چوتھی جانب اور ان سب سے بڑھ کر پریشان کن تھا "دارالاشاعت الاسلامیہ" کا انتظامی ڈھکیڑ، جس میں خوشنویس حضرات کا تعاقب، کاغذ کی مارکیٹ سے رابطہ، مطابع کے چکر، دفتری اور جلد ساز حضرات کے ساتھ "سرد و گرم" معاملات، پھر پرچے اور کتابوں کی ترسیل، ڈاک کی دیکھ بھال اور سب سے بڑھ کر حسابات کا اندراج ایسے مشقت طلب اور خالص "غیر رومانوی" قسم کے کام شامل تھے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ اُس وقت یہ تمام کام میں تن تنہا کر رہا تھا — اور اس پورے کام میں میرے صرف دو معاون تھے۔ ایک مطب کا ڈسپنسر اور دوسرے "دارالاشاعت" کے ایک جزوقتی کارکن!

الغرض — ان پانچ سالوں کے دوران صورت بالکل وہ رہی جس کا نقشہ حضرت حسرت نے اپنے اس شعر میں کھینچا ہے۔

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

بہرحال — سورۃ النجم کی آیات مبارکہ "لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝" میں بیان شدہ قانونِ خداوندی کے مطابق اس محنت و مشقت کا یہ نتیجہ تو ضرور برآمد ہوا کہ نہ صرف یہ کہ جماعت اسلامی سے لگ بھگ دس برس قبل علیحدہ ہونے والے لوگوں میں سے بہت سوں کے باطن میں دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ چنانچہ ۱۹۷۶ء میں "تنظیم اسلامی" کی تاسیس کے ضمن میں ایک اہم اجتماع بھی ہوا۔ (اگرچہ یہ کوشش بھی ع "خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود" کے مصداق ناکامی سے دوچار ہو گئی) بلکہ ہم خیال لوگوں کا ایک بالکل نیا حلقہ بھی وجود میں آگیا اور اس طرح ایک نئی تحریک کی داغ بیل پڑ گئی، لیکن اس کے ساتھ دو بحران بھی پیدا ہو گئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

چنانچہ ـــــ ایک جانب صحت متاثر ہونی شروع ہوئی اور اوائل ۷۰ء میں تو اس نے گویا بالکل جواب دے دیا۔ نتیجۃً مستقل طور پر حرارت رہنے لگی جو شام کے وقت باقاعدہ بخار کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ جیسے کہ عام طور پر ہوتا ہے' اولاً میں نے اس کی جانب توجہ ہی نہ کی' اور درد اور بخار کو دفع کرنے والی ادویات کے سہارے اپنے معمولات جاری رکھے۔ لیکن جب ایک دو بار تھوک میں خون کی آلائش بھی نظر آئی تو سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہونا پڑا۔ متعدد بار ایکسرے کرانے کے باوجود پھیپھڑوں میں تو کوئی واضح خرابی نظر نہ آئی' لیکن شام کے بخار اور ہلکی ہلکی کھانسی کے پیش نظر اکثر مخلصین کا اصرار تھا کہ ٹی بی کا علاج شروع کر دیا جائے ـــــ وہ تو بھلا ہو ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب کا کہ سختی کے ساتھ اڑ گئے کہ جب تک صریح اور مثبت شواہد نہیں ملیں گے میں ٹی بی کی ادویات استعمال کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔ انہی دنوں پروفیسر یوسف سلیم چشتی (مرحوم و مغفور) حکیم سعید احمد پھلواری (مرحوم) کو لے آئے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پھیپھڑوں کے سرطان کی تشخیص کر ڈالی۔ چشتی صاحب ان کی "نباضی" کے بے انتہا معتقد تھے' لہٰذا ان کے اصرار پر ایک کرم فرما کی وساطت سے ریلوے کیرن ہاسپٹل کے ڈاکٹر سعید صاحب سے باضابطہ "برانکوسکوپی" (BRONCHOSCOPY) کرانی پڑی جس کا نتیجہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ "پھیپھڑوں کی تمام نالیاں بالکل شیشے کے مانند صاف ہیں اور مجھے تو کہیں بلغم کی اتنی مقدار بھی نہیں ملی جسے خردبینی معائنہ کے لئے نکال لاتا!" ـــــ گویا یہ ثابت ہو گیا کہ یہ علالت نتیجہ تھی صرف جسمانی مشقت کی زیادتی' آرام کی کمی' اور اعصاب پر متضاد قسم کے کاموں کے شدید دباؤ کا!

دوسری جانب ابتدائی "فارغ البالی" کے کچھ ہی عرصے بعد مالی مشکلات نے سر اٹھانا شروع کر دیا ـــــ اور رفتہ رفتہ اس اعتبار سے بھی صورت حال تشویش ناک ہوتی چلی گئی۔

کرشن نگر کے مکان کی خرید اور اس کی ابتدائی مرمت وغیرہ کے مصارف کے بعد جو سرمایہ میرے پاس بچا تھا' اس میں سے قدرِ قلیل کسی ہنگامی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے محفوظ رکھ کر باقی کُل کا کُل میں نے "دارالاشاعت الاسلامیہ" میں کھپا دیا تھا۔ لیکن اس سے جو مطبوعات شائع ہو رہی تھیں' ظاہر ہے کہ وہ نہ تو "نرم و گرم نان" (HOT CAKES) کے مانند بکنے والی تھیں' نہ ہی چٹ پٹے ڈائجسٹوں کی طرح قبولِ عام حاصل کر سکتی تھیں' لہٰذا جلد ہی محسوس ہوا کہ کُل سرمایہ منجمد (BLOCK) ہو کر رہ گیا ہے۔ حتیٰ کہ "تدبرِ قرآن" کی جلد دوم کی اشاعت کے لئے مجھے ایک دوست سے کچھ رقم حاصل کرنی پڑی۔ (جو انہوں نے قرض کی بجائے شراکت کی اساس پر دی' اور افسوس ہے کہ اُس وقت میں بھی اس شراکت کی پیچیدگیوں کو نہ سمجھ سکا۔ لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ صرف ایک کتاب کے سلسلے میں نفع و نقصان کی شراکت حساب کتاب کے اعتبار سے ناقابلِ عمل ہے۔ لہٰذا جیسے بھی بن پڑا میں نے جلد ہی ان کی رقم معذرت کے ساتھ واپس کر دی' اگرچہ وہ اس پر کچھ جز بز بھی ہوئے۔)

جہاں تک میڈیکل پریکٹس کا تعلق ہے' میں اپنا سات آٹھ سال کا تعارف یا پیشہ ورانہ "نیک نامی" (GOOD WILL) کا سرمایہ تو منٹگمری (ساہیوال) ہی میں چھوڑ کر کراچی چلا گیا تھا۔ پھر لگ بھگ ساڑھے تین سال پریکٹس سے تقریباً لاتعلق رہا۔ مزید برآں ان گیارہ سالوں کے دوران بہت سا پانی وقت کے دریا میں بہہ چکا تھا' اور ایک کثیر تعداد میں نوجوان ڈاکٹر میدان میں آ گئے تھے' ـــــ چنانچہ لاہور میں تو گلی گلی ایم بی بی ایس ڈاکٹروں کے مطب قائم ہو چکے تھے' ان حالات میں جان توڑ محنت سے بھی مطب بس اتنا ہی جم سکا کہ میری اور میرے اہل و عیال کی بقدرِ کفاف کفالت کر سکے ـــــ جبکہ "دارالاشاعت" بھی مسلسل "ھَلْ مِن مَّزِید" کے نعرے لگا رہا تھا اور "میثاق" بھی ہر ماہ اچھے خاصے "خسارے کی سرمایہ کاری" کا متقاضی تھا!

الغرض وسط ۷۰ء تک صحت کی خرابی' اور مالی مشکلات دونوں نے مل جل کر ایک گھمبیر مسئلے کی صورت اختیار کرلی۔ اور اگرچہ داخلی طور پر تو یہ اطمینان حاصل رہا کہ بحمد اللہ اپنے مقصدِ زندگی کی خاطر وہ صورت پیدا ہوگئی کہ۔

خیریتِ جاں' راحتِ تن' صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی!

لیکن خارجی طور پر' عالمِ اسباب و علل میں "پس چہ باید کرد؟" کا سوال پوری شدت کے ساتھ سامنے آکھڑا ہوا۔

اُن دنوں برادرم اقتدار احمد سے تو مکانی فصل و بُعد بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ اس لئے کہ ان کا کاروباری مرکز بھی کراچی میں تھا اور کاروباری سرگرمیاں بھی زیادہ تر اندرونِ سندھ تک محدود تھیں۔ مزید برآں کاروباری علیحدگی کے بعد سے کچھ ذہنی اور قلبی حجابات بھی طاری ہوگئے تھے' جن میں' جیسے کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے' ان کے کاروبار میں نمایاں کامیابیوں اور ترقیوں سے پیدا شدہ مالی حیثیت کے فرق و تفاوت کی بنا پر بھی بہت کچھ اضافہ ہوگیا تھا۔

بڑے بھائی اظہار احمد صاحب نے اپنا رہائشی اور کاروباری مرکز جوہر آباد کو بنایا اور ان کے کاروبار کا دائرہ پنجاب اور سرحد میں پھیلا اور اس میں بھی فوری طور پر بہت ترقی اور وسعت ہوئی۔ لہٰذا ان کی لاہور آمد و رفت کا سلسلہ بکثرت جاری رہتا تھا۔ انہوں نے میرے حالات کا اندازہ کرکے کچھ بڑے بھائی ہونے کے ناتے' کچھ نظریاتی اور مقصدی ہم آہنگی کے پس منظر کے باعث' اور کچھ غالباً کاروباری اشتراک اور پھر علیحدگی کے ضمن میں اپنی بعض ذمہ داریوں کی ادائیگی کی خاطر ۶۹-۱۹۶۸ء کے آس پاس مالی تعاون کی صورت پیدا کرنی چاہی — لیکن میں نے کچھ طبعی غیرت اور کچھ ان کی بعض بالا زیادتیوں کے شدید ردِّ عمل کے باعث ان کا کسی قسم کا تعاون قبول کرنے

سے صاف انکار کر دیا۔

اس پر انہوں نے "زبردستی کے تعاون" کی بعض نہایت دلچسپ صورتیں اختیار کیں :

مثلاً ایک یہ کہ "تدبرِ قرآن" کی جلد اول کے سو نسخے اپنی جیب سے پوری قیمت پر خرید کر بعض اعزّہ و احباب کو ہدیہ کر دیئے (حالانکہ ان میں سے اکثر کے بارے میں ہرگز کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس کا ایک لفظ بھی پڑھیں گے۔)

دوسرے یہ کہ میرے ذاتی فون سے لمبی لمبی کاروباری ٹرنک کالیں شروع کر دیں — اور میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ یا اللہ! انہیں روکوں تو کیسے؟ اور نہ روکوں تو بل کیسے ادا ہو گا؟ — کہ انہوں نے دفعۃً کہہ دیا کہ اس فون کا پورا بل میں ادا کروں گا۔ اور اس پر میں سوائے خاموشی اختیار کرنے کے اور کچھ نہ کر سکا!

تیسرے یہ کہ اسی فون کی سہولت کے پیش نظر میرے مکان کے ایک کمرے میں اپنا لاہور آفس قائم کر دیا — (واضح رہے کہ اُن دنوں ٹیلی فون بہت کمیاب ہی نہیں تقریباً نایاب تھا اور مجھے بھی صرف مطب کی ترجیح کی بنا پر حاصل ہو گیا تھا) — اور اس کے کچھ عرصے کے بعد "حسابِ دوستاں در دل" کے مطابق گویا اس کے کرائے کے طور پر نہ صرف یہ کہ مکان کی بعض بوسیدہ چھتوں کو اپنی "تیار چھتوں" سے بدل دیا، بلکہ ان کے دفتر کے باعث جو تنگی پیدا ہو گئی تھی اس کے ازالے کے لئے دوسری منزل پر کچھ اضافی تعمیر بھی کر دی۔ جس سے مکان کی مالیت میں لامحالہ گرانقدر اضافہ ہو گیا۔

چوتھے یہ کہ جب میں نے "میثاق" کے مالی خسارے کے ناقابلِ برداشت ہونے کا ذکر "میثاق" ہی میں کیا تو انہوں نے فوراً پیشکش کر دی کہ اس کا کُل خسارہ میرے ذمے رہے گا۔ یہ ایک بالکل نئی صورت حال تھی جس سے میں دفعۃً دوچار ہوا۔ اس لئے کہ اوپر کی متذکرہ جملہ صورتیں کچھ در پردہ اور بالواسطہ تعاون کی تھیں جبکہ یہ پیشکش کھلم کھلا اور براہ راست تعاون کی تھی۔ اور میں اپنی اس ذہنی اور نفسیاتی

کیفیت کے پیش نظر جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اسے ٹھکرانے والا ہی تھا کہ اچانک میرے اندر ہی سے یہ آواز آئی کہ "تم 'میثاق' اللہ کے دین کی خدمت کے لئے شائع کر رہے ہو' اب اگر یہ مالی اسباب کی بنا پر بند ہو گیا تو تم اللہ کو کیا جواب دو گے اگر اللہ کی جانب سے یہ حجت قائم ہو کہ ہم نے تو اس کا ذریعہ پیدا فرما دیا تھا' تم نے اپنی ذاتی 'انا' کو کیوں مزاحم ہونے دیا؟" — بنا بریں میں نے خاموشی اختیار کر لی اور اس طرح بھائی جان کے "زبردستی کے تعاون" کا سلسلہ مزید دراز ہو گیا۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ جگر کے اس شعر کے مصداق کہ۔

احساسِ خودی پر ہوتی ہے اک بوجھ نگاہِ لطف و کرم
جینا وہیں مشکل ہوتا ہے' مشکل جہاں آساں ہوتی ہے

بھائی جان کے اس زبردستی کے مالی تعاون سے میرے اعصابی دباؤ میں کمی کی بجائے اضافہ ہی ہوا۔ اس لئے کہ ایک تو میری غیرت اسے گوارا نہیں کرتی تھی اور دوسرے انہوں نے اپنی زیادتیوں کے اعتراف کے ساتھ معذرت نہیں کی تھی۔

موضوعِ گفتگو کی تکمیل کی خاطر یہ عرض کر دینا مناسب ہو گا کہ برادرم اقتدار احمد اور بھائی اظہار احمد صاحب کے علاوہ دونوں چھوٹے بھائی ابھی کسی شمار قطار ہی میں نہیں تھے۔ ان میں سے عزیزم ابصار احمد تو انگلستان میں زیر تعلیم تھے اور مالی اعتبار سے خود دوسروں کے زیر کفالت تھے۔ (ان کی بیرونی تعلیم کے جملہ مصارف برادرم اقتدار احمد نے اپنے ذمے لے لئے تھے۔) البتہ ان کے خطوط سے گاہ بگاہ ہمت افزائی بھی ہوتی رہتی تھی اور یہ اطمینان بھی حاصل ہوتا رہتا تھا کہ انہیں میں نے جس مقصد کے تحت فلسفہ کے رخ پر ڈالا تھا اور جس مقصد کی داغ بیل منٹگمری کے "دار القامہ" میں پڑی تھی اس کی جانب تسلی بخش پیش رفت ہو رہی ہے۔ خصوصاً جب انہوں نے اپنے ایک خط میں یہ لکھا کہ: "جب سے یہاں (انگلستان) آیا ہوں 'اسلام کی نشأۃِ ثانیہ' کا مطالعہ چھ مرتبہ کر چکا ہوں اور ہر بار مجھے اس سے نئی رہنمائی حاصل ہوئی ہے!" تو

خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی ہوا کہ ان شاء اللہ وہ اس مقصد کے لئے مؤثر خدمات انجام دے سکیں گے جس کا خاکہ اس کتابچے میں دیا گیا ہے ـــــ رہے عزیزم وقار احمد تو وہ اگرچہ اولاً برادرم اقتدار احمد اور بعد ازاں بھائی اظہار احمد صاحب کے ساتھ کاروبار میں بالفعل شریک تھے ـــــ لیکن کچھ عمر میں کم ہونے' اور کچھ طبعاً کم گو اور نرم مزاج ہونے کے باعث کسی معاملے میں مضبوط موقف اختیار نہیں کر سکتے تھے ـــــ تاہم ان کی بھی ہمدردیاں مجھے ہمیشہ حاصل رہیں۔

وسط ۷۰ء تک ایک جانب تو' جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' متذکرہ بالا دونوں "بحران" اپنی پوری شدت کو پہنچ گئے تھے ـــــ اور دوسری جانب ۷۰ء کے عام انتخابات کے حوالے سے ذاتی طور پر میرے لئے دو مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں:-

ایک یہ کہ بھائی اظہار احمد صاحب کے دل میں کچھ تو جماعت اسلامی کے ساتھ جذباتی لگاؤ نے دوبارہ زور پکڑا ـــــ اور کچھ ملک اور قوم کی خدمت کے جذبے نے انگڑائی لی ـــــ چنانچہ انہوں نے انتخابات کی منجدھار میں چھلانگ لگا دی۔ اس سے ایک تو میرے اور ان کے مابین زندگی میں پہلی بار نظریاتی بُعد پیدا ہو گیا جس کے نتیجے میں وہ حجابات جو پانچ سال کی مدت میں بمشکل کچھ کم ہونے پر آئے تھے نہ صرف یہ کہ دوبارہ قائم ہو گئے بلکہ پہلے سے بھی دبیز تر ہو گئے ـــــ ثانیاً جب ان کی انتخابی مہم عروج کو پہنچی اور انہوں نے واقعتاً دیوانہ وار گاؤں گاؤں اور گلی گلی صدا لگانی شروع کی تو غالباً انہیں شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ میرا ایک بھائی زبان اور قلم دونوں کی صلاحیتوں سے کسی قدر بہرہ ور ہونے کے ناتے میری اس مہم میں مؤثر مدد کر سکتا تھا' جو وہ نہیں کر رہا ـــــ اور واقعہ یہی تھا کہ میں اپنے نظریاتی موقف کے ہاتھوں مجبور ہونے کے باعث ان کی اس مہم سے قطعاً لاتعلق تھا۔ لہٰذا فطری طور پر ان کی طبیعت میں شدید ردِ عمل پیدا ہوا ـــــ اور کچھ اس بنا پر' اور کچھ اس وجہ سے کہ الیکشن کی شدید مصروفیات

کے باعث ان کے کاروبار کو بھی بڑا دھکا لگا تھا' ان کی جانب سے "زبردستی کا تعاون" یکلخت بند ہو گیا۔ (اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی ایک عجیب حکمت مضمر تھی جس کا اندازہ بعد میں ہوا' ـــ چنانچہ اس کا تذکرہ بھی بعد ہی میں ہو گا اور درحقیقت اسی کی وضاحت کے لئے راقم کو اپنے اور بھائی جان کے مابین معاملات کے اس ناخوشگوار حصے کا ذکر کرنا پڑا ـــ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف بڑے بھائی کی حیثیت سے' بلکہ تحریکِ اسلامی کے ساتھ اولین تعارف کا ذریعہ ہونے کے ناتے مجھ پر ان کے بے شمار احسانات ہیں۔ اور میں اکثر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اب جبکہ وہ دنیوی کامیابیوں اور کاروباری اور پیشہ ورانہ کامرانیوں سے حصۂ وافر حاصل کر چکے ہیں۔ اور "مسنون عمر" کی بھی آخری حد کو چھو رہے ہیں ان میں دین کے لئے دوبارہ وہی جوانی والا جوش و خروش اور جذبۂ عمل پیدا ہو جائے ---وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیزٍ!)

دوسرے یہ کہ جمعیت علماء اسلام نے جو ان دنوں مولانا مفتی محمود احمد مرحوم و مغفور کی زیر قیادت خاصی فعال تھی مجھ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ میں ان کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑوں۔ چنانچہ اس سلسلے میں دو بار مولانا محمد اجمل خاں اور علامہ خالد محمود صاحب میرے مطب (یا مکان) پر تشریف لائے۔ میں نے ان حضرات سے لاکھ عرض کیا کہ میں نے تو پالیسی کے اسی اختلاف کی بنیاد پر کہ الیکشن کے ذریعے پاکستان میں اسلامی نظام نہیں قائم کیا جا سکتا' جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تھی' اب میں کیسے الیکشن میں حصہ لے سکتا ہوں۔ لیکن ان کی جانب سے اصرار جاری رہا ـــ ادھر کرشن نگر کے حلقے کی جماعت اسلامی کی ایک رسماً متفق لیکن عملاً سرپرست شخصیت' حاجی محمد لطیف (مرحوم و مغفور) نے ان حضرات کو میرے پاس آتے جاتے دیکھا تو یہ گمان کرتے ہوئے کہ شاید یہ حضرات کسی اور امیدوار کے لئے تعاون (SUPPORT) حاصل کرنے کی غرض سے چکر لگا رہے ہیں' پُر جلال انداز میں فرمایا: "اگر یہ لوگ ایسے ہی مخلص ہیں تو آپ کو کیوں نہیں کھڑا کرتے!" اس پر جب

میں نے عرض کیا : "حاجی صاحب! وہ تو میرے پاس اسی لئے تشریف لائے تھے!" تو انہوں نے فوراً فرمایا کہ "اگر ایسا ہے تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ جماعت اسلامی بھی آپ کے مقابلے میں کوئی امیدوار کھڑا نہیں کرے گی۔ بلکہ آپ کو SUPPORT کرے گی!" (واضح رہے کہ حاجی صاحب موصوف خود تو جماعت اسلامی کے علاقائی "سرپرست" تھے ہی' ان کے صاحب زادگان بھی اس ڈیموکریٹک یوتھ فورس کے چوٹی کے قائدین میں سے تھے جو اُس وقت جماعت کی عوامی قوت کے اہم ترین ستون کی حیثیت رکھتی تھی — چنانچہ ان کے ایک صاحب زادے "شوکتِ اسلام" کے جلوس میں مولانا مودودی مرحوم و مغفور کے محافظِ خصوصی کی حیثیت سے ان کے بالکل برابر ایستادہ رہے تھے!) اس پر میں نے ہنستے ہوئے عرض کیا کہ : "حاجی صاحب! میرے پاس تو شاید ضمانت کے پیسے بھی نہ ہوں!" تو انہوں نے فرمایا کہ : "زرِ ضمانت بھی میرے ذمہ رہا!"

اس پر میں یہ انتہائی راز کی بات بتانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ' میں نے اپنے اندر واقعتاً بالکل وہی کیفیت محسوس کی جو کسی انگریز آئی سی ایس افسر کے بارے میں بیان کی جاتی ہے کہ جب اسے کسی شخص نے رشوت پیش کی تو ابتداءً تو اس نے اسے شرافت اور ملائمت کے ساتھ رد کر دیا' لیکن جب وہ شخص مسلسل اصرار بھی کرتا رہا اور رشوت کی رقم بھی بڑھاتا چلا گیا تو ایک خاص حد تک پہنچ جانے کے بعد اس انگریز افسر نے اس شخص کو نہایت سختی اور درشتی کے ساتھ حکم دیا کہ "میرے کمرے سے فوراً نکل جاؤ' اس لئے کہ اب تم 'میری قیمت' کے بہت قریب پہنچ گئے ہو!" — چنانچہ میں نے بھی یہ اندیشہ شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ اگر یہ بات آگے بڑھی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے نفس کی گہرائیوں میں حبِ جاہ کی کوئی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھے' اور میں بھی انتخابی سیاست کی دلدل میں پھنس کر ہمیشہ کے لئے اپنی منزل کھوٹی کر لوں — بنابریں میں نے ملک سے راہِ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت محسوس

کی اور برادر عزیز وقار احمد کو کراچی فون کر دیا کہ میرے لئے عمرے کا بندوبست کریں تاکہ ایک تو میں انتخابات کے ہنگامے سے الگ تھلگ رہ سکوں۔ اور دوسرے حرمین شریفین کی پرسکون اور روح پرور فضا میں ٹھنڈے دل کے ساتھ غور و فکر کر کے اپنا آئندہ لائحہ عمل طے کر سکوں۔ عزیزم وقار احمد نے سوال کیا: "آپ کب جانا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا: "تم کارروائی شروع تو کرو' میں تاریخ بھی جلد بتا دوں گا!" — مجھے کیا پتہ تھا کہ کراچی میں یہ کام کس آسانی اور عجلت کے ساتھ ہو جاتے ہیں' انہوں نے دوبارہ کہا کہ آپ جب بھی جانا چاہیں گے انتظام ہو جائے گا!" اس پر میں نے تو گویا اپنے طور پر بہت مشکل ذمہ داری ان پر ڈال دی کہ: "میں تو ایک ہفتے کے اندر اندر روانہ ہو جانا چاہتا ہوں!" لیکن انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ: "بس آپ تیار ہو کر آ جائیں' آپ جملہ انتظامات موجود پائیں گے!" اور واقعتاً جب میں چند دن کے اندر اندر وہاں پہنچا تو مجھے نہ صرف عمرے کا ویزا' اور پی آئی اے کا چار ماہ کا رعائتی ٹکٹ تیار ملا — بلکہ حفظانِ صحت کے ٹیکے بھی "لگے لگائے" مل گئے (یعنی بغیر ٹیکہ لگوائے مصدقہ سرٹیفکیٹ حاصل ہو گیا!) — یہ دوسری بات ہے کہ میں لاہور سے متعلقہ ٹیکے لگوا کر گیا تھا اور اس سفر میں میرے پاس دو ہیلتھ سرٹیفکیٹ تھے۔ ایک جعلی اور دوسرا اصلی۔

میرا یہ سفر جو ۱۵/۱۶ شعبان المعظم سے ۱۷/۱۸ ذی الحج ۱۳۹۰ھ تک پورے ایک سو بیس دن (یا تبلیغی بھائیوں کی اصطلاح میں تین چلوں) پر محیط رہا' میری زندگی کا طویل ترین سفر بھی تھا اور ہر اعتبار سے اہم ترین بھی۔ اس لئے کہ اسی کے دوران' عین حج کے موقع پر' میں نے اپنی حیاتِ دنیوی کا اہم ترین فیصلہ کیا۔ یعنی میڈیکل پریکٹس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد' اور جملہ صلاحیتیں اور توانائیاں' اور کُل اوقات وقف برائے نشر و اشاعتِ دعوتِ قرآن و سعیٔ اقامتِ دین و اعلاءِ کلمۃ اللہ!!

یہ فیصلہ جو اِس وقت چند الفاظ میں بیان ہو گیا ہے، اُس وقت کئی ماہ کے مسلسل غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد ہو سکا تھا، جس کے دوران ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا کہ عقل و فہم کی جملہ صلاحیتیں ماؤف سی ہو گئی تھیں، حتیٰ کہ عارضی طور پر یادداشت بھی بالکلیہ زائل ہو گئی تھی! اور چند ساعتیں تو مجھ پر فی الواقع اس حال میں گزری تھیں کہ۔

نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں، سو یہ بھی کیا معلوم!

لہٰذا اس کے ضمن میں کسی قدر تفصیل مناسب ہے۔

اپنے ذاتی مسئلے میں رہنمائی کے لئے میں نے مکہ مکرمہ میں طواف اور سعی کے دوران بھی قلب کی گہرائیوں سے دعائیں کی تھیں۔ اور پورے ماہ رمضانِ مبارک کے دوران بھی میں مسلسل دعا بھی کرتا رہا تھا اور کسی قدر سوچ بچار بھی کرتا رہا تھا۔ اور اگرچہ رمضان مبارک کی اپنی مصروفیات اور خصوصاً روحانی کیف و سرور نے مسئلے کے حل کی جانب زیادہ متوجہ ہونے کی مہلت نہیں دی تھی، تاہم تحت الشعور میں "پس چہ باید کرد؟" اور "To be or not to be is the question" کی ادھیڑبن دھیمے دھیمے انداز میں جاری رہی تھی!

رمضان مبارک کے اختتام پر ایک تو ویسے بھی ایک نوع کے Anti-Climax کی سی کیفیت لازماً پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ خلا کا سا احساس ہونے لگتا ہے اور ایک گونہ اداسی اور افسردگی سی طاری ہو جاتی ہے، اور طیبہ کے رمضان کے بعد تو یہ معاملہ بہت ہی نمایاں تھا— پھر پاکستان کے عام انتخابات میں تمام مذہبی جماعتیں جس طرح چاروں شانے چِت ہوئی تھیں اور بڑے بڑے سیاسی اور صحافی پنڈتوں کی پیشین گوئیوں کے بالکل برعکس پاکستان کے مشرقی اور مغربی دونوں خِطوں میں خالص سیکولر مزاج کی حامل جماعتوں کو واضح اور مطلق اکثریت حاصل ہو گئی تھی،

اس کا بھی دل و دماغ پر شدید اثر تھا۔ ایسے میں جب ذہن نے توجہ کے پورے ارتکاز کے ساتھ اپنے مسئلے پر غور کرنا شروع کیا' اور ایک جانب معاش اور اہل و عیال' دوسری جانب دین اور اس کی دعوت و تحریک' اور تیسری جانب "عافیتِ جاں' راحتِ تن' صحتِ داماں" کے تلخ مگر سنگین حقائق ایک دم ذہن میں تازہ ہو گئے تو میں نے بالکل ایسے محسوس کیا جیسے میں پہاڑ تلے آ گیا ہوں۔

ایک بات تو اس عرصے کے کچھ شعوری اور کچھ غیر شعوری غور و فکر کے نتیجے میں بالکل قطعی اور دو ٹوک انداز میں سامنے آ چکی تھی — یعنی یہ کہ معاش و مطب اور دعوت و تحریک' دونوں کو میں جس انداز میں گزشتہ پانچ سال کے دوران ساتھ لے کر آگے بڑھتا رہا تھا وہ اب مزید جاری رہنا ناممکن تھا اور حالات ایک ایسے فیصلہ کن دوراہے پر آ پہنچے تھے کہ "یا چناں کن یا چنیں!" کے انداز میں ایک دو ٹوک فیصلہ لازمی تھا۔

مجھے اپنے سامنے دو راستے واضح طور پر نظر آ رہے تھے جن میں سے کسی ایک کو ذہن و قلب کی کامل یکسوئی کے ساتھ اختیار کرنا اور دوسرے کو واضح شعوری فیصلے کے ساتھ ترک کرنا ناگزیر ہو گیا تھا:۔

ایک یہ کہ مطب بند کر دوں۔ اور پریکٹس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر اپنے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ وقت دعوت اور تحریک کے لئے وقف کر دوں۔ اور معاش کے معاملے میں کلیۃً اللہ پر توکّل کروں اور اس یقین کا سہارا لوں کہ : "وَكَأَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝" (العنکبوت : ۶۰) — اور

دوسرے یہ کہ دعوت و تحریک کے ضمن میں جتنی پیش رفت ہو چکی ہے اس سے بھی کسی قدر پسپائی اختیار کر کے اسے ایک سطح پر منجمد (SEAL) کر دوں' اور اپنی اصل توجہ کو مطب اور معاش پر مرتکز کر کے ثانوی درجے میں درس و تدریس کا کام

جس قدر بھی ہو سکے اس پر اکتفا کر لوں۔

پہلی بات کہنے میں جس قدر آسان تھی، واقعتاً اتنی ہی مشکل اور کٹھن تھی۔ اور اگرچہ بحمد اللہ میرا ذاتی رجحان اسی کی جانب تھا لیکن یہ حقائق بھی پوری شدت کے ساتھ پیش نظر تھے کہ مطب کے سوائے معاش کا کوئی ظاہری یا مرئی ذریعہ یا وسیلہ سرے سے موجود نہ تھا، چنانچہ نہ کوئی زمین تھی نہ جائیداد، اور روئے ارضی پر میری کُل "ملکیت" اس مکان کی صورت میں تھی جس میں میں اور میرے اہل و عیال رہائش پذیر تھے، لہٰذا وہ بھی کسی آمدنی کا ذریعہ نہیں بن سکتا تھا، رہی نقد پونجی تو وہ ایک قدرِ قلیل کے سوا سب کی سب "دارالاشاعت" کے اسٹاکس کی صورت میں جامد (BLOCK) ہو چکی تھی، دوسری جانب میں تنہا نہ تھا بلکہ نو دس افراد کے کنبے کا واحد کفیل تھا، پھر تا حال نہ کوئی جماعت تھی نہ تنظیم جس کی جانب سے "کفاف" کی توقع کی جا سکے۔ رہا خاندان، تو اس کا شیرازہ بھی بالکل منتشر ہو چکا تھا اور صورت بالکل وہ بن چکی تھی کہ ع "دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا!" ـــــ الغرض، یہ تمام تلخ مگر سنگین حقائق مجھے اپنے سر پر بالکل "وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ" کی سی کیفیت کے ساتھ معلق نظر آ رہے تھے۔ اور ان سب پر مستزاد، اور بعض پہلوؤں سے ان سب سے مشکل سوال یہ تھا کہ اگر

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

کے مصداق ان تمام حقائق و واقعات کو نظر انداز کر کے چھلانگ لگا دی جائے تو آیا یہ دین اور شریعت کی رو سے جائز بھی ہو گا یا نہیں؟

رہی دوسری صورت تو یہ آسان بھی تھی اور دنیا کے عام دستور اور چلن کے موافق بھی ـــــ لیکن مجھے یہ صریحاً "خودکشی" کے مترادف نظر آتی تھی۔ اس لئے کہ میں نے پورے بیس سال قبل اٹھارہ برس کی عمر اور نیم شعوری کے دور میں "فرائضِ

دینی" کے ایک خاص تصور کے مطابق اپنی زندگی کا ایک رخ متعین کر کے سفر کا عملاً آغاز کر دیا تھا۔ پھر جیسے جیسے معلومات میں اضافہ ہوا، اور شعور میں پختگی پیدا ہوتی گئی اس تصور اور رخ کے بارے میں اعتماد اور یقین میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا اور جب قرآن حکیم اور سنت و سیرتِ رسول ﷺ تک براہ راست رسائی ہوئی تب تو "وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي" کے مصداق پورا انشراح اور اطمینان حاصل ہو گیا کہ ع "جا ایں جا است!" اور "اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ" — پھر اس ذہنی اور قلبی انشراح کے ساتھ ساتھ بحمد اللہ عملی پیش قدمی بھی جاری رہی تھی۔ چنانچہ زمانۂ طالب علمی میں اسی تصور کے حسنِ معنی کی خاطر خوب سوچ سمجھ کر اور پورے شعوری طور پر اپنے تعلیمی اور پیشہ ورانہ کیریئر کی قربانی کا فیصلہ کیا تھا۔ اور مسلسل بیس برس تک بفضلہٖ تعالیٰ جسم و جان کی بہتر اور بیشتر توانائیاں اسی رخ پر صرف کئے رکھی تھیں۔ (اس میں جو ذرا سی کمی ان تین سالوں کے دوران آئی تھی جو مشترک خاندانی کاروبار میں شمولیت کی صورت میں بسر ہوئے، تو اس کا اصل سبب بھی "سیر عن اللّٰہ اِلَی اللّٰہ" کے مانند اسی مقصدِ زندگی کے نام پر دی جانے والی دعوت کے سوا کچھ نہ تھا۔) اور بحمد اللہ اس وقت تک میرا ضمیر بالکل مطمئن تھا کہ بفضلہٖ تعالیٰ میں نہ صرف یہ کہہ

"واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی"

کے معیار پر پورا اترا تھا — بلکہ میں نے اپنے تصورات و معتقدات اور زندگی کے رخ اور مقصد کی خاطر "غیروں" کے "ناوکِ دشنام" کے وار بھی خوشدلی سے سہے تھے اور "اپنوں" کے "طرزِ ملامت" کی بھی ہر ادا کو برداشت کیا تھا۔ اور جہاں اپنے موقف کی صحت کے یقین کی بنیاد پر دشمنوں سے جنگیں لڑی تھیں وہاں اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک

کہتے ہوئے دوستوں اور بزرگوں سے بھی لڑائی مول لی تھی ـــــ لیکن مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ اس سب کے بعد اگر اب، جبکہ مجھ پر اللہ کا مزید کرم یہ ہو گیا تھا کہ اُس اللہ نے اپنی کتابِ حکیم کے ساتھ قلبی انس اور ذہنی مناسبت عطا فرمادی تھی اور نہ صرف یہ کہ اس کے فہم کے لئے میرے ذہن و قلب کے دروازے کھول دیئے تھے بلکہ اس کی تفہیم و تبلیغ کے لئے میری زبان کو بھی رواں کر دیا تھا، محض پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر یا جسم و جان کی صحت و خیریت کی خاطر میں نے اس راہ سے انحراف تو کجا اس کی ترجیحات (Priorities) میں کوئی ردوبدل بھی کیا تو میں یقیناً ع "میں ہوں اپنی شکست کی آواز!" ـــ اور ع "وہ بد نصیب جو گر جائے اپنی آنکھوں سے!" کا مصداقِ کامل بن کر رہ جاؤں گا۔ پھر اس معنوی خودکشی کے بعد محض حیوانی جبلّتوں کی خاطر اور ایک جدید طبّی اصطلاح کے مطابق "Human Vegetable" کی صورت میں زندہ رہنا "چہ ضرور؟" گویا ع "نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا!" ـ کسی غیر معروف شاعر کے یہ دو اشعار مجھے بے حد پسند ہیں :۔

اک تصور کے حسنِ معنی پر
ساری ہستی لٹائی جاتی ہے
زندگی ترکِ آرزو کے بعد
کیسے سانسوں میں ڈھالی جاتی ہے

الغرض، یہ تھی وہ ادھیڑ بن جس میں مَیں رمضانِ مبارک کے بعد شدت کے ساتھ مبتلا ہو گیا تھا۔ کہ دل پہلی راہ کی جانب کھینچتا تھا اور توکّل و تفویض کی راہ دکھاتا تھا تو نفس دوسرے راستے کی طرف رہنمائی کرتا تھا اور ساتھ ہی یہ "رشوت" بھی پیش کرتا تھا کہ سعودی عرب کی ملازمت اختیار کر لو، تنخواہ بھی اچھی ملے گی، حج اور عمروں کی سہولت بھی میسر رہے گی، اور حرمین کی نمازوں کے ذریعے اجر و ثواب کے انبار بھی جمع کئے جا سکیں گے، جن سے کسی نہ کسی حد تک دعوت و اقامتِ دین کی راہ سے پسپائی

اختیار کرنے کی تلافی بھی ہو جائے گی۔ (واضح رہے کہ اُس وقت تک سعودی عرب میں پاکستانی ڈاکٹروں کی مانگ بہت تھی!)

میں اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھا' اور اس شش و پنج نے مجھے بالکل اس کیفیت سے دوچار کر دیا تھا جو حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے جو ایک حدیث میں وارد ہوئے ہیں' یعنی: "قَدْ اَمْرَضَتْنِی وَاَسْقَمَتْنِی وَاَحْزَنَتْنِی" ("جس نے مجھے بیمار کر دیا ہے اور نڈھال کر دیا ہے اور غمزدہ کر دیا ہے۔" حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ ایک طویل حدیث میں وارد ہوئے ہیں جسے احمدؒ' بزارؒ' نسائیؒ' ابن ماجہؒ' اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے اسے حدیث حسن قرار دیا ہے!) کہ اچانک لندن سے برادر عزیز ابصار احمد کی زور دار دعوت موصول ہوئی کہ آپ کے پاس حج تک کافی وقت ہے' کیوں نہ ایک چکر انگلستان کا لگالیں؟ — میرے دل نے بھی صلاح دی کہ زندگی کا اہم ترین اور مشکل ترین فیصلہ مسلسل ایک ہی فضا میں رہتے ہوئے کرنے سے بہتر ہے کہ ایک مختلف بلکہ مخالف ماحول میں اپنی قوتِ ارادی اور ذہن و قلب کی استقامت و مقاومت کو آزما لیا جائے — چنانچہ فوراً پروگرام بن گیا — اور برادرم صہیب حسن کی معیت میں دوسرا عمرہ ادا کرتے ہوئے جدّہ آنا ہوا۔ اور وہاں بھی انہی کی رہنمائی میں لندن کے لئے ویزا کے حصول اور پھر سستے ٹکٹ کی تلاش کے مراحل طے ہوئے' اور اغلباً ۱۶/ دسمبر ۱۹۷۰ء کو میری لندن اور ان کی نیروبی روانگی ہو گئی — اور غالباً ۱۵/ دسمبر کی سہ پہر کو جدہ ہی میں میرے اعصاب پر جو شدید دباؤ پچھلے دو ہفتوں کے دوران رہا تھا' اس کا ظہور اس طور سے ہوا کہ مجھے دفعتاً اپنے ذہن میں ایک مہیب خلا محسوس ہوا اور میری یادداشت بالکلیہ جواب دے گئی۔ چنانچہ بالکل ایسے لگتا تھا جیسے میری نگاہوں کے سامنے کی چیزوں کے سوا ہر شے اور ہر بات میرے ذہن سے اوجھل اور حافظے سے محو ہو گئی ہے۔ اُس روز چند گھنٹے مجھ پر جس شدید الجھن میں گزرے اس کی یاد ہی سے مجھ پر لرزہ

طاری ہو جاتا ہے — اور میں اللہ کی پناہ مانگنے لگتا ہوں۔ میری اس کیفیت پر برادرم صہیب حسن بھی سخت پریشان ہوئے، تاہم وہ ہر طرح مجھے سکون پہنچانے کی کوشش کرتے رہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ رات کی آمد کے ساتھ ہی یہ کیفیت ختم ہو گئی اور میں گویا دوبارہ دنیا میں آگیا۔

ایامِ حج میں میں اپنی اس الجھن کے بارے میں مسلسل غور کرتا رہا جس پر سوچ بچار کو میں نے اسی موقع کے لئے مؤخر کر دیا تھا۔ وہ الجھن یہ تھی کہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ کرتے ہوئے اتنا بڑا فیصلہ کر تو رہا ہوں کہ حصولِ معاش کے واحد ذریعے یعنی مطب کو بند کر دیا جائے درانحالیکہ دوسرا کوئی مرئی اور محسوس و مشہود ذریعہ سرے سے موجود نہیں ہے اور سوائے اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر "اندھے" اعتماد (BLIND FAITH) کے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی — اور یہ بھی یقیناً اللہ تعالیٰ ہی کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس پر میرے دل کو مطمئن کر دیا ہے — لیکن ایک پہلو سے میرا یہ فیصلہ "خلافِ قرآن" ہے، اس لئے کہ قرآن مجید نے انسان کی شعوری پختگی کی عمر چالیس سال قرار دی ہے بمفہوائے آیتِ قرآنی : "حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً..... الآیہ" (الاحقاف : ۱۵) اور میں اتنا بڑا اقدام اس وقت کر رہا ہوں جبکہ ابھی پورے انتالیس سال کا بھی نہیں ہوا۔

یہاں یہ وضاحت مناسب ہے کہ یہ آیۂ مبارکہ اور اس کے حوالے سے یہ خیال کہ انسان کی نفسیاتی اور شعوری پختگی کی عمر چالیس سال ہے، بہت عرصہ سے میرے ذہن میں موجود تھا — چنانچہ نومبر ۱۹۶۵ء میں جب والد صاحب مرحوم کا انتقال ہوا، اور اس صدمے کا غم ہلکا کرنے کے لئے میں نے برادرم وقار احمد کی معیت میں وادیٔ کاغان کا رخ کیا (جس میں میں اپنی پرانی ہلمین کار میں وادیٔ کاغان کے درمیانی مقام جرید تک پہنچ گیا تھا) — تو جاتے یا آتے ایک دن کا قیام ایبٹ آباد میں اپنے ایک عزیز

کے مکان پر ہوا— وہ نومبر کی ۲۶ تاریخ تھی اور مجھے اچانک یاد آیا کہ یہ بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کا یوم پیدائش ہے۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ ان دنوں میرے تعلقات ان سے خاصے کشیدہ تھے' میں نے ایبٹ آباد ہی سے انہیں ایک خط تحریر کیا تھا کہ : آج آپ انتالیس سال پورے کرکے چالیسویں میں داخل ہوگئے ہیں' اور یہی از روئے قرآن انسان کی پختگی کی عمر ہے' لہٰذا آپ ذرا اپنے ماضی اور حال پر دوبارہ نظر ڈالیں— اور غور کریں کہ عنفوانِ شباب میں آپ نے تحریک اسلامی کا دامن کن جذبات اور احساسات اور کن عزائم اور امنگوں کے ساتھ تھاما تھا— اور اب آپ بالکلیہ کن مشاغل و مصروفیات میں منہمک ہیں!— اپنے اس خط میں بھی میں نے پوری آیۂ مبارکہ درج کردی تھی اور پھر لاہور واپسی پر "میثاق" کے خوشنویس صاحب سے اس کی خوشنما کتابت کراکے بھی ارسال کردی تھی۔ اور بعد ازاں اس کا چربہ "میثاق" میں بھی شائع کردیا تھا۔ (اور اب بھی اس کا عکس اس تحریر کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔)

مزید برآں اسی آیۂ مبارکہ کے حوالے سے میرے ذہن میں بعض اوقات یہ خیال بھی آتا تھا کہ بعض سابق داعیان و خادمانِ دین کی مساعی میں ثبات و استقلال کی کمی کا سبب بھی شاید یہی تھا کہ انہوں نے اپنی دعوت و تنظیم کا آغاز نیم پختہ عمر میں کردیا تھا۔ چنانچہ آغاز تو بلاشبہ ع "دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!"— اور ع "آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم!" والا تھا لیکن افسوس کہ انجام بھی ع "ہوگئے خاک' انتہا یہ ہے!" سے مختلف نہ ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ خود میں نے اُس وقت تک ایک "داعی" کی حیثیت سے سامنے آنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اور میں اپنی حیثیت واقعتاً قرآن حکیم کے ایک ادنیٰ طالب علم یا زیادہ سے زیادہ خادم کی سمجھتا تھا— اور اُس وقت بھی میرے سامنے اصل مسئلہ کسی نئی دعوت یا جماعت کے آغاز کا نہیں تھا' بلکہ صرف تعلیم و تعلّمِ قرآن

کی ہمہ وقت و ہمہ تن خدمت کے لئے مطب کو بند کر دینے کا تھا— لیکن چونکہ یہ بھی بجائے خود ایک بڑا فیصلہ تھا لہٰذا مجھے اس میں تردّد اور تذبذب تھا کہ آیا مجھے چالیس سال کی عمر سے قبل اتنا بڑا اقدام کر گزرنا چاہئے یا نہیں؟

عرفات میں میں نے اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے خصوصی دعا کی اور بار بار دعاءِ استخارہ کو دہرایا— لیکن تذبذب میں کوئی کمی نہیں آئی۔ لیکن واپسی پر ایک روز حرم میں بیٹھے ہوئے اچانک دماغ میں بجلی سی کوندی اور دفعۃً یہ خیال دل میں آیا کہ قرآن کی تقویم قمری ہے' اور قمری سال شمسی سال سے دس دن کے قریب چھوٹا ہوتا ہے— اب جو اپنی عمر کا حساب لگایا تو سارے عقدے ایک دم حل ہو گئے' اس لئے کہ اس وقت شمسی حساب سے میری عمر انتالیس برس سے لگ بھگ ڈھائی ماہ کم تھی— گویا کہ قمری حساب سے میں تقریباً چالیس برس کا ہو چکا تھا!

لہٰذا اسی وقت آخری فیصلہ بھی کر لیا اور اللہ سے عہد بھی باندھ لیا کہ :

"پروردگار! میں عہد کرتا ہوں کہ آج کے بعد سے اپنی توانائیوں یا صلاحیتوں یا اوقات کا کوئی حصہ تلاشِ معاش میں صَرف نہیں کروں گا— اور اپنے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ وقت تیری کتابِ مبین اور تیرے دینِ برحق کی خدمت کے لئے وقف رکھوں گا— رہا میری اور میرے اہل و عیال کی معاش کا معاملہ تو وہ کلیۃً تیرے سپرد ہے۔

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را!

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

باب سوم

فروری ۱۹۷۱ء سے ستمبر ۱۹۹۲ء تک

"وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰى"

کا عکس' اور

"وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ"

کا ظہور و ثبوت

فروری ۷۱ء سے لے کر ان سطور کی تحریر کے وقت تک (۱۰ ستمبر ۱۹۹۲ء) اور آئندہ جب تک اللہ تعالیٰ اس دنیا میں رکھے' یہ ازروئے قرآن حکیم (سورۂ احقاف : ۱۵) میری زندگی کا شعوری بلوغ اور نفسیاتی پختگی کا دور ہے' جس کے شمسی تقویم کے مطابق ساڑھے اکیس' اور قمری حساب سے سوا بائیس برس بیت چکے ہیں (اس لئے کہ میری عمر اِس وقت شمسی حساب سے ساڑھے ساٹھ برس اور قمری تقویم کے مطابق باسٹھ برس ہو چکی ہے[1]!) اور اگرچہ میری ذہنی اور قلبی کیفیت تو بہت سے رفقاء و احباب کے علم میں ہے کہ کئی سال سے بالکل یہ ہے کہ ۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے' باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں!

اور واقعہ یہ ہے کہ "مسنون عمر" سے زیادہ کی تو ہرگز کوئی آرزو یا تمنا نہاں خانۂ قلب میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے ـــ ہاں' آرزو ہے تو صرف یہ کہ اللہ جب بھی واپس بلائے اپنے خصوصی فضل و کرم سے' جو اب تک بھی زندگی کے ہر سانس کے

---

[1] اور اب اس میں مزید ڈیڑھ سال کا اضافہ ہو چکا ہے۔

ساتھ شاملِ حال رہا ہے' یہ کیفیت بھی عطا فرمادے کہ ع "چوں مرگ آید تبسم برلبِ اوست" "وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیزٍ!" تاہم "وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ" کی طرح یہ بھی کسی کے علم میں نہیں ہے کہ واپسی کا اذن کب ہوتا ہے! بہرحال ان اکیس بائیس سالوں کے دوران ـــــ میرے طبعی کسل' جسمانی ضعف اور ہمت کی کمی (بحمد اللہ پستی نہیں!) کے باعث جو کوتاہی اور تقصیر ہوئی اس کے لئے ربِّ جبّار و قہار سے عفو و درگزر کا امیدوار ہوں' اس لئے کہ یہ "وسعت" اور "شاکلہ" بندے کے لئے خالق کی جانب سے موہوب (Given) ہوتا ہے' اور قیامت کے دن حساب کتاب اسی کی نسبت سے ہوگا' بفحوائے: "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا" (البقرہ: ۲۸۶) اور "لَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا" (الانعام: ۱۵۲' الاعراف: ۴۲' المومنون: ۶۲) اور "قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ' فَرَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ ھُوَ اَھْدٰی سَبِیْلًا" (بنی اسرائیل: ۸۴)

اسی طرح اس امر پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہ کسی شعوری اور ارادی ہوسِ جاہ اور طلبِ شہرت سے اس نے بچائے رکھا ہے' اگر تحت الشعور یا لاشعور کی سطح پر ہوسِ اقتدار' طلبِ عزت' خود نمائی کی خواہش' ریاکاری کا جذبہ یا محض انجمن آرائی کا ذوق و شوق کارفرما رہا ہو ـــــ تو اللہ تعالیٰ سے اس کا بھی خواستگار ہوں کہ اپنی شانِ غفاری و ستاری کے طفیل عفو و صفح' اور غفر و ستر کا معاملہ کرے اور اس کا بھی کہ اپنے پاس واپس بلانے سے پہلے پہلے میرے باطن کو ان آلودگیوں سے پاک اور صاف کردے: اَللّٰھُمَّ زَکِّ نَفْسِی فَاِنَّکَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰھَا ـــــ اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قَلْبِی مِنَ النِّفَاقِ وَ عَمَلِی مِنَ الرِّیَاءِ وَ لِسَانِی مِنَ الْکَذِبِ وَ اَعْیُنَنِی مِنَ الْخِیَانَۃِ' فَاِنَّکَ تَعْلَمُ خَائِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَ مَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ! آمین یاربَّ العالمین!!

البتہ ایک بات جو بالکل ظاہر و باہر بھی ہے' اور اسی بنا پر قابلِ تحقیق و توثیق بھی'

وہ یہ ہے کہ میں پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وسط فروری ۱۹۷۱ء سے لے کر آج تک میں نے بحمداللہ اپنے وقت کا کوئی لمحہ' اور اپنی قوت اور توانائی کا کوئی شمہ حصولِ معاش کے لئے صَرف نہیں کیا (سوائے ایک چند ماہ کی ایک یا دو گھنٹے روزانہ کی جزوی "ملازمت" کے جو ایک مرتبہ پھر خاندانی مجبوری کے تحت ہوئی) بلکہ "جو کچھ اور جیسا کچھ" واہبِ حقیقی کی جناب سے عطا ہوا تھا اسے امکانی حد تک پورے کا پورا اسی کے کلام اور پیغام کی نشر و اشاعت' اور اسی کے دین کی دعوت و اقامت کی جدّوجہد میں صرف کر کے گویا ع "جان دی' دی ہوئی اسی کی تھی!" کے مصداق اسی کے قدموں میں ڈال دیا۔ اور "حق" نہ صرف یہ ہے کہ "حق ادا نہ ہوا" بلکہ یہ بھی کہ جس درجہ میں بھی ہوا محض اسی کی توفیق سے ہوا: "وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ"۔!

میری زندگی کے یہ اکیس بائیس سال (بلکہ دوبارہ لاہور منتقل ہونے کے بعد سے آج تک کے ستائیس[1] سال!) کوئی ڈھکی چھپی شے نہیں ہیں' بلکہ بحمداللہ ایک کھلی کتاب کے مانند ہیں۔ میں نے معروف معنی میں نہ کوئی "آپ بیتی" آج تک لکھی ہے' نہ لکھنے کا ارادہ ہے' لیکن توفیق و تائیدِ خداوندی سے جو کچھ مجھ سے اس عرصے میں بن آیا ہے اس کا ذکر کتابوں میں بھی ہے (بالخصوص "عزمِ تنظیم" اور "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں جو مطبوعہ شکل میں موجود اور دستیاب ہیں' اور تنظیم اسلامی کی "رودادوں" میں جو فی الوقت دستیاب نہیں ہیں) اور "میثاق" اور "حکمت قرآن" کے فائلوں پر مستزاد لاتعداد سمعی اور بصری کیسٹوں میں بھی — اور سب سے بڑھ کر انجمن ہائے خدّام القرآن' قرآن اکیڈمیوں' قرآن کالج اور قرآن آڈیٹوریم ایسی ٹھوس حقیقتوں کی صورت میں بھی ہے اور تنظیم اسلامی اور تحریکِ خلافت کی معنوی لیکن فعال اور متحرک حقیقتوں کی شکل میں بھی — لہٰذا مجھے یہاں اپنی

---

[1] جواب لگ بھگ انتیس سال بن چکے ہیں۔

"کارگزاری" کے کسی تذکرے کی کوئی حاجت نہیں ہے، چنانچہ اس وقت اس اکیس بائیس سالہ دور کے بارے میں مجھے صرف اپنے معاشی حالات اور مالی معاملات کا ذکر کرنا ہے، تاکہ ایک جانب "یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ یَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ" (الطلاق : ۲-۳) کی تفصیل سامنے آجائے اور دوسری جانب میرے معاشی معاملات کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں یا کردی گئیں ان کی وضاحت اور ازالہ ہوجائے۔ (چنانچہ یہی پہلو تھا جس کے پیش نظر ۸۸ء والی تحریر کی اشاعت پر تنظیم اسلامی کے بعض اہم رفقاء نے زور دیا تھا، جبکہ خود میں مذبذب ہوگیا تھا!)

۱— میں نے جب وسط فروری ۷۱ء میں مطب کے خاتمے اور ہمہ وقت دین کی خدمت کے لئے وقف ہوجانے کا فیصلہ کیا، اس وقت میری کل "مالی کائنات" یہ تھی:

(i) کرشن نگر لاہور میں دس مرلے کا ایک دو منزلہ مکان جو پانچ سال قبل -/۴۵۰۰۰ میں خرید کیا تھا۔ لیکن اب کچھ مرمت اور اضافی تعمیر (جس کا ذکر پہلے ہوچکا ہے) اور گرانی یا افراطِ زر کے باعث اس کی قیمت ڈیڑھ دو لاکھ ہوچکی تھی۔

(ii) منٹگمری میں لگ بھگ بارہ مرلے کے اس مکان کی "نصف ملکیت" جو الاٹ تو والد صاحب کے نام ہوا تھا لیکن محکمہ بحالیات کو اس کی قیمت میں نے اور بھائی اظہار نے ادا کی تھی۔

(iii) مطب کا ساز و سامان، فرنیچر اور کچھ ادویات کا اسٹاک۔

(iv) "دار الاشاعت الاسلامیہ" کا کتابوں کا اسٹاک جس کی قیمت کا اندازہ چالیس پچاس ہزار کے لگ بھگ ہوگا۔

(v) گھر کا ساز و سامان — اور اہلیہ کا کچھ زیور — اور

(vi) چند ہزار روپے نقد جو گھریلو اخراجات کے لئے چند ماہ تک کفایت کرسکتے تھے!

۲— حج سے واپس آتے ہی میں نے دو کام فوری طور پر بلا کسی تاخیر کے کئے:

(i) ادویات اور مطب کا کچھ سامان فروخت کردیا — اور کچھ فرنیچر بعض احباب کو ہدیہ

کردیا اور اس طرح گویا مطب کی واپسی کی "کشتیاں" فوری طور پر جلادیں۔
(ii) دو بچیاں جو پرائمری اسکول میں زیر تعلیم تھیں انہیں اسکول سے اٹھالیا۔ اور ان کے لئے صرف گھریلو تعلیم پر قناعت کرلی۔ تاکہ (ا) اخراجات میں کمی ہو۔ اور (ب) وہ اسکولوں کے عام چلن اور فیشن اور خصوصاً استانیوں کے عمومی رجحانات سے اثر پذیر نہ ہوں۔ (دونوں بڑے بیٹے اُس وقت سنٹرل ماڈل ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے اور ان کے معاشی مستقبل کے لئے دنیوی تعلیم ناگزیر تھی۔)

۳ — اور اس کے بعد جس کامل یکسوئی کے ساتھ دعوتِ تعلّم و تعلیم قرآن اور تحریک رجوع الی القرآن کو آگے بڑھانے میں ہمہ وقت اور ہمہ تن منہمک ہوا' اس کی روداد "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" نامی تالیف میں تفصیلاً موجود ہے — بہرحال اس کا یہ ٹھوس نتیجہ تو ظاہر ہی ہے کہ ایک ہی سال میں "مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" کا قیام عمل میں آگیا۔

۴ — معاشی اور مالی اعتبار سے "فتح باب" کی پہلی صورت یہ سامنے آئی کہ غالباً وسط ۷۲ء میں برادرم اقتدار احمد میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ "میں آپ کے ساتھ تعاون کا خواہشمند ہوں!" — جس پر بحمد اللہ میں نے ان سے یہی کہا کہ "اگر تم یہ تعاون صرف بھائی ہونے کے ناتے کرنا چاہتے ہو تو میری غیرت کو گوارا نہیں ہے۔ لیکن اگر میرے مشن میں شرکت کے خواہاں ہو تو جو تعاون کرو گے قبول ہوگا!" — اس پر جب انہوں نے کھلے دل' اور واضح الفاظ میں یقین دلایا کہ صورت واقعتاً دوسری ہی ہے تو میں نے ان کے تعاون کو قبول کرنے کی ہامی بھرلی — چنانچہ انہوں نے :
(i) ایک جانب اپنی ایک نئی کمپنی (احمد کنکریٹ لیمٹڈ) میں' جس کے تحت ایک کارخانہ لگایا جارہا تھا' کچھ حصص اپنی جانب سے میرے نام کردیئے — اور اس کے سالانہ منافع وغیرہ کے حساب میں مجھے (غالباً) پندرہ سو روپے ماہوار ادا کرنا شروع کردیا۔ (کچھ عرصے کے بعد ان کا یہ ماہانہ "زرِ تعاون" دو ہزار تک بڑھ گیا۔)

(ii) دوسری جانب جیسے ہی مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا مجوزہ خاکہ سامنے آیا اس کے "مؤسسین" میں شرکت اختیار کر لی۔ (انجمن میں بحمد اللہ اسی حیثیت سے عزیزم وقار احمد سلمہ بھی شامل ہو گئے۔ چنانچہ بعد میں جب مؤسسینِ انجمن کے نام حروفِ تہجی کی ترتیب سے درج ہوئے تو یہ خوبصورت شکل سامنے آئی کہ اول نام برادرم اقتدار احمد کا تھا اور آخری عزیزم وقار احمد کا ۔۔ شاید یہی حکمت ہو اس میں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب بھائیوں میں صرف ایک نام "واؤ" سے شروع کرایا!) بعد میں برادرم اقتدار احمد مع جملہ اہل و عیال تنظیم اسلامی میں بھی شامل ہو گئے!

۵۔۔ انجمن کے قیام کے بعد تو صورت حال یکدم اور یکسر تبدیل ہو گئی اور میں اچھا بھلا خوشحال ہی نہیں 'اچھا خاصا "سرمایہ دار" بن گیا۔ اس لئے کہ:

(i) "دارالاشاعت الاسلامیہ" کی بساط لپیٹ دی گئی۔ اور اس کا پورا اسٹاک مکتبہ انجمن نے خرید لیا۔ جس سے میرا منجمد سرمایہ واگذار ہو گیا!

(ii) انجمن نے میرے اصرار کے علی الرغم مجھے ۱۲۔ افغانی روڈ سمن آباد پر واقع اپنے مرکز میں "رہائش 'بجلی 'پانی 'گیس اور فون" کی سہولتیں مفت بہم پہنچا دیں (انجمن کے ذمہ دار حضرات بالخصوص شیخ محمد عقیل اور چودھری نصیر احمد وِرک تو اس پر بھی مصر تھے کہ میں ایک مہمانداری الاؤنس بھی قبول کر لوں ۔۔ لیکن میں نے اسے منظور نہیں کیا) چنانچہ میرے ذاتی مکان واقع کرشن نگر کا کرایہ میری صافی (NET) آمدنی بن گیا۔ (یہ پہلے بھائی اظہار کا دفتر رہا۔ پھر کچھ عرصہ بھائی اظہار اور برادرم اقتدار کے مشترک کاروبار کا دفتر رہا۔ اور بعد ازاں برادرم اقتدار کے پاس رہا۔)

۶۔۔ اس سے قبل میرے حلقہ ہائے درسِ قرآن کے لئے نقل و حرکت کی سہولت کے لئے ایک سوزوکی وین (VAN) کی خرید کا معاملہ اس طور سے ہو چکا تھا کہ اس کے لئے دس ہزار روپے عزیزم وقار احمد نے دیئے تھے اور پانچ پانچ ہزار روپے برادرم ڈاکٹر محمد یقین 'ڈاکٹر ظہیر احمد 'اور ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ نے Contribute کئے۔

۷— اسی اثنا میں میں نے اپنے منٹگمری والے مکان کا حصہ بھی بھائی اظہار کے ہاتھ فروخت کر دیا!

۸— اس طرح "مطب بند کر دو گے تو کھاؤ گے کہاں سے؟" کی آزمائش جو لگ بھگ دو سال تک نہایت خوفناک اور لاینحل صورت میں درپیش رہی تھی' دیکھتے ہی دیکھتے ایک ڈیڑھ سال ہی کے اندر اندر اس طرح تحلیل ہو کر رہ گئی کہ اگر یہ کسی اور کے ساتھ ہوا ہوتا اور وہ مجھے اس کی تفصیل سناتا تو خود میں اسے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا۔

۹— چنانچہ وہ دن اور آج کا دن میں بحمد اللہ عہدِ حاضر کی جملہ سہولتوں سے بقدرِ ضرورت بہرہ ور رہوں' چنانچہ متذکرہ بالا جملہ سہولتیں بھی مجھے مسلسل حاصل رہیں' اور چار پہیوں والی سواری بھی ہمیشہ دستیاب رہی' اور ان میں سے کسی چیز کی کمی کے باعث میرے کام میں کبھی کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوئی۔ "اِک بندۂ عاصی کی اور اتنی مداراتیں!" کے اس ذاتی تجربہ کے بعد بھی اگر مجھے اللہ کی ربوبیت اور اس کی "یَرْزُقُہٗ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ" والی شان پر یقین اور وثوق و اعتماد نہ ہو تو تُف ہے مجھ پر اور میرے قلب و ذہن پر!!

۱۰— البتہ اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ میں نے اپنے کھانے پینے اور رہن سہن کے معیار کو کبھی لوئر مڈل کلاس کی سطح سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اور اس معاملے میں میں اپنے خیال کے مطابق تو "اَلْقَصْدُ فِی الْفَقْرِ وَالْغِنٰی" پر عمل پیرا رہا ہوں' لیکن دیکھنے والوں کو شاید "بخل" کا بھی خیال ہوا ہو' چنانچہ ان وضاحتوں میں غالباً کوئی حرج نہیں ہے کہ (i) میرے گھر میں "دوسرا سالن" اور "سویٹ ڈش" کا تصور صرف کسی مہمان داری یا تقریب کے ساتھ وابستہ ہے' ورنہ عام طور پر صرف ایک سالن پکتا ہے۔ (ii) میں نے ۵۵ء کے بعد سے آج تک ایک پیسہ بھی "فرنیچر" پر خرچ نہیں کیا۔ اور آج بھی ہمارے یہاں وہی پلنگ زیرِ استعمال ہیں جو میں نے ۵۵ء

میں بنوائے تھے۔ چنانچہ میرے گھر میں کوئی جدید "BED" نہیں ہے۔ اور میں خود اس پلنگ پر سوتا ہوں جو ۵۵ء میں بنوایا تھا۔ پہلے اس میں نوار لگی ہوئی تھی۔ جب وہ بوسیدہ ہوگئی تو اسی چارپائی پر لکڑی کا تختہ جڑوالیا گیا اور وہی میری "استراحت گاہ" ہے — یہ لکڑی کا تختہ میری کمر کی تکلیف کے اعتبار سے بھی ضروری تھا! — وَقِس علٰی ذٰلک !! — بہرصورت میں نے یہ احتیاط ہمیشہ برتی کہ اپنے گھریلو اخراجات اپنی "ذاتی آمدنی" (جو ایک عرصہ تک کرشن نگر والے مکان کے کرایہ پر مشتمل تھی) کے اندر اندر محدود رکھے، اور جو "تعاون" برادرم اقتدار احمد کی جانب سے ہوتا رہا اسے جمع کرتا رہا (i) اس نیت کے ساتھ کہ اگر کبھی انجمن یا تنظیم کو کوئی ہنگامی ضرورت پیش آئی تو اس میں صرف کردوں گا — اور (ii) اس خیال کے تحت کہ اگر کبھی برادرم اقتدار احمد کے مزاج میں تبدیلی آجائے اور تعاون کا یہ سلسلہ بند ہو جائے تو مجھے اپنے ذاتی اخراجات میں کمی کرنا دشوار نہ ہو جائے!

۱۱ — ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں آگیا اور اس میں شمولیت کی شرائط میں انکم ٹیکس وغیرہ کے معاملات میں بھی شدید پابندیاں عائد ہوگئیں تو میں نے برادرم اقتدار احمد سے کہہ دیا اب میں احمد کنکریٹ کا حصہ دار نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے ان حصص کی نقد قیمت ادا کردی جس سے (i) ماڈل ٹاؤن میں ایک کنال کا قطعۂ زمین خرید لیا گیا۔ اور (ii) میری چار پہیوں والی سواری کی سطح بھی سوزوکی وین سے بلند تر ہو کر ٹویوٹا کرولا کو پہنچ گئی۔

۱۲ — اسی زمانے میں بھائی اظہار احمد اور برادرم اقتدار احمد کا دوبارہ کاروباری اشتراک ہوا اور اس میں برادرم اقتدار کے مطالبے پر از سرِ نو سب بھائی جمع ہوئے تو میں نے حصہ داری اور ڈائریکٹری سے تو کچھ سابقہ تجربے، اور کچھ تنظیم اسلامی کی پابندیوں کی بنا پر معذرت کرلی، البتہ ایک یا دو گھنٹے روزانہ کی جزوقتی ملازمت قبول کر لی۔ جس کا مشاہرہ چار ہزار روپے ماہانہ مع "ڈرائیور سمیت کار" تھا۔ اور اس طرح یہ

چند ماہ پھر ایک طرح کی "عیاشی" میں بسر ہوئے۔

۱۳— آج سے چار پانچ سال قبل جب برادرم اقتدار احمد نے بھی اپنا نیا دفتر (واقع لوئر مال) تعمیر کر لیا تو میرے کرشن نگر والے مکان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اسے کسی دوسرے شخص کو کرائے پر دے کر مستقل دردِ سر مول لینے پر آمادہ نہیں تھا' لہٰذا کچھ عرصے تک تو برادرم اقتدار احمد اسے خالی رکھ کر بھی کرایہ ادا کرتے رہے لیکن پھر میرے کہنے پر انہوں نے اسے فروخت کر دیا (اس معاملے میں بھی یہ واقعہ بہت سبق آموز ہے کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں اس مکان کے چھ لاکھ روپے لوں گا' چنانچہ انہوں نے ایک گاہک سے اتنی ہی رقم میں سودا طے کر لیا۔ لیکن جب رجسٹری کا مرحلہ آیا تو خریدار نے اسٹامپ ڈیوٹی کے خیال سے کم قیمت کی رجسٹری کرانی چاہی' جس پر میں نے انکار کر دیا۔ اور اس طرح برادرم اقتدار احمد درمیان میں پھنس گئے کہ ایک جانب مشتری سے وعدہ کر لیا تھا اور دوسری جانب بائع یعنی مجھ سے چھ لاکھ کی کمٹمنٹ تھی۔ چنانچہ انہوں نے رجسٹریشن فیس میں غالباً چالیس ہزار روپے اپنی جیب سے ادا کر کے پورے چھ لاکھ ہی کی رجسٹری کرائی — چنانچہ اتنی رقم کی رجسٹری کرشن نگر کے دس مرلے کے مکان کی شاید ہی کبھی کوئی اور ہوئی ہو۔!)

۱۴— ماڈل ٹاؤن کا متذکرہ بالا ایک کنال کا پلاٹ — اور کرشن نگر کے مکان سے حاصل شدہ چھ لاکھ روپے اب قرآن اکیڈمی کے بالمقابل واقع مکان کی صورت اختیار کر چکے ہیں جو دو منزلوں میں تین تین کمروں کے چار فلیٹوں کی صورت میں ہے جو میں نے اپنے چاروں بیٹوں کو ہبہ کر دیئے ہیں۔ (اگرچہ ماڈل ٹاؤن سوسائٹی میں غالباً پورا مکان عزیزم عارف کے نام ہے۔)

۱۵— لیکن اس کی تفصیلی اور عملی صورت یہ ہوئی ہے کہ جو رقم میرے پاس برادرم اقتدار کے "ماہانہ زرِ تعاون" کے ذریعے جمع ہوئی تھی اس سے میں نے اپنی پانچوں بیٹیوں کے نام ان ہی کی ایک فیکٹری میں حصص خرید دیئے (جس کے بارے میں

انہوں نے یہ فیصلہ واضح طور پر کرلیا تھا کہ اس کے حسابات بالکل درست رکھے جائیں گے' خواہ کچھ بھی ہو جائے!) اور ان کی مالیت سے دگنی رقم تو میں نے متذکرہ بالا فلیٹوں کے ضمن میں بیٹوں کو بھی ہبہ کردی تھی' بقیہ ان کے ذمہ قرض تھا' جو وہ اب قسط وار ادا کر رہے ہیں جس سے میرا گھریلو خرچ چل رہا ہے!

۱۶— قیامت کے روز جو پانچ سوال (ایک حدیث کی رو سے) ہر انسان سے کئے جانے والے ہیں ان میں سے دو مال سے متعلق ہوں گے یعنی "وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَیْنَ اکْتَسَبَهٗ وَفِیْمَا اَنْفَقَهٗ" کہ کہاں سے کمایا تھا اور کہاں خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ اس دن کے حساب کی سختی سے بچاکر "حِسَابًا یَسِیْرًا" کے دامن میں پناہ دے دے— تاہم اپنی دعوتی' تحریکی اور تنظیمی زندگی کا یہ "حسابِ کم و بیش" آج اس لئے علیٰ رؤس الاشہاد پیش کردیا ہے کہ (i) اپنوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کا موقع شیطان کو حاصل نہ رہے— اور (ii) غیروں اور دشمنوں کو بھی جھوٹی الزام تراشی اور تہمت طرازی پر کچھ شرم تو محسوس ہو!

بہرحال' اپنے اور غیر سب کان کھول کر سن لیں : اس پوری دنیا میں متذکرہ بالا مکان کے سوا جو اَب اصلاً میرے بیٹوں کی ملکیت ہے' میرا نہ کوئی مکان ہے نہ دکان' نہ کوئی پلاٹ ہے نہ فلیٹ' نہ کسی کمپنی میں کوئی حصّہ ہے نہ کسی بھی قسم کے دوسرے حصص' نہ میرے پاس کوئی سرٹیفکیٹ ہیں نہ بانڈز---اور میری کُل جائیداد یا تو گھر کا ساز و سامان ہے' یا ایک پرانی کار! بینک میں میرے واحد ذاتی (کرنٹ) اکاؤنٹ میں آج کی تاریخ میں کُل ۸۴۴۷ روپے جمع ہیں[1]' اس کے علاوہ اہلیہ کے پاس بھی صرف کچھ تھوڑی سی پس انداز کی ہوئی نقدی

---

[1] اور آج ۹/ مئی ۹۴ء کو وہ بھی صرف -/۱۴۵۹ رہ گئے ہیں۔

ہے' اور پانچ تولے سے بھی کم سونے کا زیور[1] مزید برآں' اب کوئی ماہانہ "زرِتعاون" بھی کسی بھائی کی جانب سے مجھے نہیں ملتا!!

۱۷— الحمدللہ کہ بروقت یاد آگیا کہ — دو "جائیدادیں" ایسی بھی ہیں جو قانوناً میری "ملکیت" ہیں لیکن حقیقت میں "وقف" ہیں اور میں ان کا صرف متولی ہوں :-

(i) گڑھی شاہو میں واقع عمارت جس میں تنظیم اسلامی کے مرکزی دفاتر بھی قائم ہیں اور میرے داماد ڈاکٹر عبدالخالق اور تنظیم کے معتمد چودھری غلام محمد صاحب کی رہائش بھی (اس کا پلاٹ مجھے حاجی عبدالواحدؒ نے ہبہ کیا تھا اور اس کی تعمیر میں اگرچہ بعض دوسرے رفقاء نے بھی حصہ لیا' لیکن اس میں غالب صَرف برادرم اقتدار احمد ہی کا تھا)۔ اور (ii) کراچی میں فلیٹ نمبر۱۱۔ داؤد منزل' فریئر روڈ' جس میں تنظیم اسلامی حلقہ سندھ کا دفتر قائم ہے۔ جس کی ملکیت "تام" نہیں' صرف پگڑی کی مالیت تک محدود ہے۔ اس کی خرید میں بڑی رقم سیٹھ عثمان صاحب کی تھی جس کا وعدہ انہوں نے مجھ سے ٹورنٹو (کینیڈا) میں کیا تھا۔ کچھ حصہ بعض رفقاء تنظیم کا تھا۔ اور کچھ خرچ اس پرائیویٹ اکاؤنٹ سے ہوا تھا جس کا ذکر نمبر۱۹ میں ہوا ہے!

۱۸— یہ بیان نامکمل بھی رہے گا' اور حق تلفی بھی ہوگی اگر عزیزم وقار احمد سلّمہ کے مالی تعاون کا بھی ذکر یہاں نہ ہو جائے۔ کاروباری اعتبار سے ان کی زندگی میں اس اعتبار سے بہت "آمد و رفت" رہی ہے کہ میرے Q.C.C سے علیحدہ ہو جانے کے بعد کچھ عرصہ وہ برادرم اقتدار کے ساتھ رہے' پھر کچھ عرصہ بھائی اظہار کے ساتھ رہے' پھر دوبارہ اقتدار کے پاس آگئے' پھر دوسری بار کے کاروباری اشتراک میں شامل ہو گئے' اور بھائی اظہار اور اقتدار کی علیحدگی کے بعد ایک بار پھر کچھ عرصہ بھائی

---

[1] اور وہ بھی حال ہی میں سب سے چھوٹے بیٹے عزیزم آصف حمید کی جانب سے ان کی دلہن کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے! چنانچہ اب بحمداللہ میری اہلیہ کے پاس بھی سوائے کانوں کی مختصر سی بالیوں اور ہاتھوں کی دو چوڑیوں کے اور کوئی طلائی زیور نہیں ہے!

اطہار کے ساتھ رہے اور پھر بالآخر بالکل آزاد ہو گئے — ان مختلف ادوار میں ان کے میرے ساتھ تعاون کی صورتیں مختلف رہیں۔ مثلاً (i) میرے ۷۱-۷۰ء کے آمد و رفتِ حجاز مقدس کا ٹکٹ انہوں نے ہی خریدا تھا' (ii) جیسے کہ پہلے بیان ہو چکا ہے پہلی سوزوکی وین کی خرید میں دس ہزار ان کے شامل تھے۔ (iii) پھر میرے تنظیم اسلامی کے سلسلے میں طویل اسفار کے لئے نسان ویگن بھی ڈیڑھ لاکھ روپے میں انہوں نے ہی خرید کر دی تھی (وہ خود بھی تنظیم میں شامل تھے!) (iv) اس کے بعد مختلف مواقع پر وہ کچھ زکات کی رقوم مجھے دیتے رہے تاکہ اپنی صوابدید کے مطابق ان کے وکیل کی حیثیت سے خرچ کر دوں (v) اب آخر میں میری پرانی ٹویوٹا کار کو نسبتاً بہتر کار سے تبدیل کرنے کے لئے بھی انہوں نے ایک لاکھ روپیہ پیش کیا تھا جو میں نے قبول کر لیا تھا!

۱۹— ایک مزید اہم بات یہ کہ عزیزم وقار کی طرح بعض دوسرے حضرات بھی کچھ رقوم مجھے خالص ذاتی طور پر دیتے رہے ہیں کہ اپنی صوابدید کے مطابق دین کے کام میں خرچ کر دوں' جن کے ذریعے میں بعض رفقاء و احباب کی ذاتی ضرورتیں بھی وقتاً فوقتاً پوری کر دیتا ہوں' اور بعض حضرات کے لئے قرضِ حسنہ کی صورت بھی اختیار کرتا ہوں۔ اور اس کا کُل حساب ذاتی طور پر میرے ہی پاس ہے جس کا نہ انجمن خدام القرآن سے کوئی تعلق ہے نہ تنظیم اسلامی سے۔

۲۰— مالی حساب کتاب کے ضمن میں یہ آخری بات بھی ہرگز کم اہم نہیں ہے کہ میرے بیرون پاکستان اسفار پر جو بہت سے لوگوں کے لئے صرف حیران کن ہی نہیں مرعوب کن بھی ہیں آج تک کوئی ایک پیسہ بھی نہ انجمن خدام القرآن لاہور کا صرف ہوا ہے نہ تنظیم اسلامی کا — یہ سارا خرچ وہ لوگ برداشت کرتے ہیں جو مجھے مدعو کرتے ہیں! — اسی طرح میرا آج تک نہ کوئی حج سرکاری خرچ پر ہوا ہے نہ عمرہ' مزید برآں ان پر کبھی کوئی رقم نہ تنظیم کے بیت المال سے خرچ ہوئی ہے نہ انجمن کے'

بعض حج اور اکثر عمرے تو امریکہ جاتے آتے بغیر کسی اضافی خرچ کے ہو گئے اور صرف ایک بار ایک سفرِ حجاز کلیۃً ایک رفیق ڈاکٹر شجاعت علی برنی کے خرچ پر ہوا! اس لئے کہ اس کے لئے خصوصی دعوت ذاتی طور پر ان ہی کی جانب سے تھی! اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل و کرم سے جس درجہ بچائے رکھا ہے' اس کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ ۸۰ء میں' میں امریکہ میں تھا جب سابق صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق مرحوم کا U.N.O. کی جنرل اسمبلی سے خطاب کا پروگرام بنا۔ انہوں نے سفارت خانوں کے ذریعے مجھے تلاش کرا کے یہ پیغام (جو مجھے مانٹریال' کینیڈا میں ملا) دیا کہ آپ امریکہ ہی سے سرکاری وفد میں شرکت پسند کریں گے یا واپس آکر یہاں سے شریک ہو سکیں گے۔ جس پر میرا جواب تھا: "کسی صورت میں بھی نہیں!" — چنانچہ میں اس اجلاس میں "سامع" کی حیثیت سے تو موجود تھا لیکن "سرکاری وفد" کے رکن کی حیثیت سے نہیں!

۲۱ — اوپر چونکہ آخری کا لفظ استعمال کر چکا ہوں' لہٰذا اب اسے تتمہ قرار دے لیں کہ میں نے انجمن خدام القرآن لاہور سے جو سہولتیں حاصل کیں وہ کلیۃً یک طرفہ نہیں ہیں' اس لئے کہ مکتبہ انجمن کو جو نفع میری تصانیف اور تالیفات' اور آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کے ذریعہ ہو تا رہا ہے وہ انجمن کے حسابات سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اور اس حساب میں کبھی کوئی ایک پیسہ بھی میں نے وصول نہیں کیا۔ اور بحمد اللہ میری کسی رائلٹی کی کوئی وراثت ایسی نہیں ہے جو میری اولاد کو منتقل ہو!

۲۲ — ایک مزید تتمہ یہ کہ — میں نے شادی بیاہ کی رسومات کے خلاف جو جہاد شروع کیا اس کا یہ نقد فائدہ مجھے حاصل ہوا ہے کہ اپنی کسی بچی کی شادی پر مجھے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرنا پڑا (سوائے اطلاع عام کے لئے جو اخباری اشتہار شائع کیا گیا اس کے رعایتی معاوضے کے!) — البتہ بیٹوں کی شادیوں پر مہر اور ولیمہ دونوں پر کچھ خرچ ہوا۔ جس کا انتظام اللہ تعالیٰ نے پاکستان ٹی وی کے ذریعے کرا دیا — (اگرچہ یہ واضح

رہے کہ ٹی وی پروگراموں کا یہ معاوضہ جبری تھا' ورنہ میرا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے کوئی معاوضہ نہ دیا جائے' لیکن جب بات یہاں تک پہنچ گئی کہ اس صورت میں پروگرام ہو ہی نہیں سکتا تب مجھے ماننا پڑا — اور یہ غالباً اس بنا پر تھا کہ اس صورت میں وہ پروگرام میری ملکیت قرار پاتے جو کارپردازانِ ٹی وی کارپوریشن کو منظور نہ تھا)

۲۴— اب حقیقتاً آخری بات یہ کہ مجھے "جنگ" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ بھی میر خلیل الرحمٰن مرحوم نے جبراً دیا تھا' جس کا ایک حصہ میں شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کو دیتا رہا۔ اس لئے کہ وہ ان کی تسوید و تبییض میں مدد کرتے تھے — آج کل جو مضامین "نوائے وقت" میں شائع ہو رہے ہیں وہ خالص بلا معاوضہ ہیں!

30/16/36

بقیہ : الہدیٰ

میں بھی آیا چاہتا ہے۔ یہ گویا پیشگی خبر تھی غزوۂ بدر کی جو نقطۂ آغاز ہے ایک طویل سلسلۂ قتال کا جس کے پہلے مرحلے کا اختتام ہوتا ہے نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں سفر تبوک پر۔ اب ان شاء اللہ آئندہ اس منتخب نصاب کے حصہ پنجم میں صرف ایک تقریر میں کوشش کی جائے گی کہ اس پورے سلسلۂ قتال پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے۔ وآخر دعوانا اَنِ الحمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِین!!

قرآن کالج ـــــ بعض اہم فیصلے

قرآن کالج سے دلچسپی رکھنے والے قارئین تک یہ اطلاع یقیناً پہنچ چکی ہو گی کہ آئندہ تعلیمی سال سے کالج میں ایف۔اے تربیتی سال ختم کر دیا جائے گا اور لاہور بورڈ کے نصابی مضامین کے ساتھ کالج کے اضافی مضامین کی بھرپور تدریس ان شاء اللہ دو سال ہی میں مکمل کی جائے گی۔ اس طرح اس سال میٹرک پاس کرنے والے جو طلبہ قرآن کالج میں داخلہ لیں گے وہ دو سال میں ایف اے کر سکیں گے۔ قرآن کالج کے بورڈ آف گورنرز نے اپنے حالیہ اجلاس میں دو مزید اہم فیصلے کئے ہیں جن سے ہم اپنے قارئین کو مطلع کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

آئندہ تعلیمی سال سے اگر اللہ نے چاہا تو قرآن کالج میں ایم۔اے معاشیات اور ایم۔اے عربی کی تدریس کا آغاز ہو جائے گا۔ پروگرام یہ ہے کہ ان شاء اللہ جولائی ۹۴ء کے آخر میں ایم۔اے کی کلاسوں میں داخلہ دیا جائے گا اور اگست ۹۴ء میں تدریس کا باقاعدہ آغاز ہو گا۔ یہ بات بھی طے کی گئی ہے کہ ایم اے کلاسوں میں داخلہ صرف ڈے سکالرز کو دیا جائے گا' تاہم قرآن کالج ہی سے گریجویشن کرنے والے طلبہ اس قاعدے سے مستثنیٰ ہوں گے۔

آئندہ تعلیمی سال سے ان شاء اللہ العزیز بی۔اے سالِ اول اور سالِ دوم میں دیگر نصابی اور اضافی مضامین کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر کی ابتدائی تعلیم (application packages) کا سرٹیفکیٹ کورس بھی مکمل کروایا جائے گا۔ اس طرح قرآن کالج سے گریجویشن کرنے والے طلبہ کو کمپیوٹر کی مبادیات سے بھی بخوبی واقفیت حاصل ہو سکے گی۔ واضح رہے کہ کمپیوٹر کے سرٹیفکیٹ کورس کے لئے نہ تو طلبہ سے کوئی اضافی فیس لی جائے گی اور نہ ہی ان کی ٹیوشن فیس میں کوئی اضافہ کیا گیا ہے' البتہ "لیب" (LAB) چارجز کے طور پر ان طلبہ کو ۵۰ روپے ماہانہ ادا کرنے ہوں گے۔ ایم۔اے کی کلاسوں میں داخلہ لینے والے طلبہ کو بھی اجازت ہو گی کہ وہ لیب چارجز ادا کر کے کمپیوٹر کے سرٹیفکیٹ کورس میں شمولیت کر سکیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے حلقہ احباب میں نہ صرف قرآن کالج کو متعارف کروائیں گے بلکہ مذکورہ بالا فیصلوں سے بھی انہیں آگاہ کریں گے۔ مزید تفصیلات جاننے کے خواہش مند حضرات درج ذیل پتے پر رجوع فرمائیں:

قرآن کالج' ۱۹۱۔ اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور۔ فون ۵۸۳۶۳۷

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS &
SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS,
FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS
NTN
BEARINGS

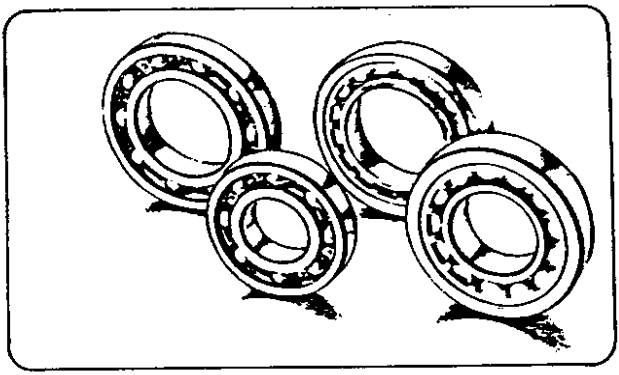

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65,
Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) — Amin Arcade 42,
Brandreth Road, Lahore-54000
Ph : 54169

GUJRANWALA : — 1-Haider Shopping Centre, Circular Road,
Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

ONTHLY
Meesaq
AHORE

REG. No. L. 7360
Vol. 43. No. 6
JUNE 1994

"ہے کوئی اِس جیسا شربت تو بتائیں؟"

فش

جامِ شیریں

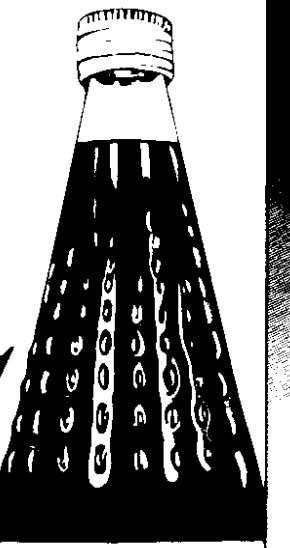

"خالص قدرتی اجزاء کے عرقیات سے تیار۔ پانی میں فوراً حل ہوجاتا ہے اور طبیعت میں بھاری پن نہیں لاتا۔ اور ہاں ... اس میں عرقِ صندل بھی شامل ہے جو گرمی میں ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا مزہ مجھے کیا سارے گھر کو بے حد پسند ہے!"

100 فیصد خالص 100 فیصد تسکین